جلد ۷۷ فروری ۱۹۷۲ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

آپکے بچوں کیلئے ایسی کتابیں

جو دلچسپ بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔

مُفید بھی ہیں اور پاکیزہ سیرت ساز بھی۔

۱	ہماری کتاب قاعدہ	۱-۰۰
۲	" " حصہ اوّل	۱-۱۰
۳	" " حصہ دوم	۱-۵۰
۴	" " حصہ سوم	۱-۵۰
۵	" " " چہارم	۱-۷۵
۶	" " " پنجم	۳-۷۵
۷	" " " ششم	۳-۰۰
۸	اخلاقی کہانیاں حصہ اوّل	۰۰-۸۰
۹	" " " دوم	۰۰-۸۰
۱۰	" " " سوم	۰۰-۶۰
۱۱	" " " چہارم	۰۰-۶۰
۱۲	نبیوں کے حالات حصہ اول	۰۰-۸۰
۱۳	" " " دوم	۰۰-۸۰
۱۴	نبیوں کے حالات حصہ سوم	۱-۰۰
۱۵	" " " " چہارم	۱-۵۰
۱۶	موتیوں کا ہار حصہ اوّل	۰۰-۸۰
۱۷	" " " دوم	۰۰-۸۰
۱۸	" " " " سوم	۱-۰۰
۱۹	" " " " چہارم	۱-۴۰
۲۰	اِنسان کی کہانی	۱-۷۵
۲۱	لاسلکی کی کہانی	۰۰-۸۰
۲۲	پیٹرولیم کی کہانی	۰۰-۷۵
۲۳	باغ والے	۰۰-۸۰
۲۴	غار والے	۰۰-۸۰
۲۵	ہاتھیوں والے	۰۰-۸۰
۲۶	سنیچر والے	۰۰-۸۰

پورا سیٹ خریدنے پر آپکو ۲۰ فیصد رعایت اور ڈاک خرچ بھی فری۔ آج ہی اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیے۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور مغربی پاکستان

فون ۶۸۳۴۱

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۶ | فروری ۱۹۷۲ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ | عدد ۶

ترجمان القرآن، لاہور
۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ-لاہور

چندہ سالانہ : آٹھ روپے - فی پرچہ : ۸۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جن نامساعد بلکہ تشویشناک حالات میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے وہ سب کے سامنے ہیں۔ جسد پاکستان کا نصف حصّہ اس سے الگ ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت جسے اسلام کا حِصار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دنیا میں رُسوائی ہوئی ہے۔ ملک کا جو حصّہ بچ گیا ہے اس کی حالت بھی شکستہ کشتی کے اُن ٹوٹے پھوٹے تختوں سے کسی طرح بھی بہتر نہیں جو خوفزدہ مسافروں کو جن کے عزیزو اقارب سمندر کی لہروں کی نذر ہو چکے ہوں ان کو اپنے اوپر لادکر تاریک رات میں تلاطم خیز موجوں کی زد میں ہچکولے کھاتے پھر رہے ہیں۔ ان بیکسوں کے پاس نہ تو پتوار ہیں اور نہ بادبان۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سمندر کی تند و تیز موجیں انہیں کس طرف بہائے جا رہی ہیں اور اُن کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ جس قوم کے افراد کی ذہنی کیفیت ان مسافروں کی سی ہو کیا وہ ایک لمحہ کے لیے ایک دوسرے سے عدمِ تعاون کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟ مشترک خطرات تو جان کے دشمنوں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کو متحد کر دیتے ہیں۔ کیا پاکستان کی تباہی ہمیں ایک دوسرے سے قریب نہیں کر سکتی؟ جب مکان کو آگ لگی ہوئی ہو تو اس کے مکین اپنا وقت اختلافات کی راہیں نکالنے میں ضائع نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس آگ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان حالات میں یہ سوچنا کہ پاکستان کا کوئی شہری بھی صدرِ مملکت سے بھرپور تعاون کرنے میں گریز کر سکتا ہے بہت بڑی زیادتی ہے۔

سوال صرف یہ ہے کہ وہ کونسے ایسے مسائل ہیں جن میں اس وقت تعاون کی ضرورت ہے اور جن کے حل کے لیے ہر فرد کو صدر صاحب سے تعاون کرنا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ صاحبِ صدر محض

اپنا امیج بنانے کے لیے تو پاکستان کے ہر طبقۂ خیال سے تعاون کی اپیلیں نہیں کر رہے۔ اخبارات میں اُن کے جو بیانات اپنی ذات کے بارے میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے بارے میں کچھ زیادہ فکر مند نہیں۔ اس وقت اُن کی پوری توجہ ملکی فلاح و بہبود پر لگی ہوئی ہے۔ بالفرض اگر ان کے شیدائی یہ سمجھتے بھی ہوں کہ جب تک ان کی ذات کا سحر انگیز امیج قائم نہ کیا جائے اُس وقت تک پاکستان کا وقار بلند نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی ملک کے سربراہ کی پُرکشش شخصیت ہی ملک کی سربلندی کا باعث بنتی ہے تو پھر بھی ساری قوم کو اس مقصد میں اپنی صلاحیتیں کھپانے کی ضرورت نہیں کیونکہ حکومت کی تحویل میں ابلاغِ عامہ کے وسیع ذرائع اور صاحبِ صدر کی مضبوط جماعت کے لاکھوں افراد اس کام میں ہمہ تن مصروف ہیں اور وہ اس خدمت کو اس جوش و خروش کے ساتھ سر انجام دے رہے ہیں جو کسی دوسری جماعت کے لیے قریب قریب ناممکن ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب صدرِ محترم اپنی ذات کے معاملے میں کافی حد تک بے نیاز ہیں اور اگر اس کی کسی قدر ضرورت ہے تو حکومت کے نشر و اشاعت کے ذرائع اور پیپلز پارٹی کے کارکن اسے بطریقِ احسن پورا کر رہے ہیں تو پھر فکر و عمل کے وہ کونسے میدان ہیں جن میں صدر صاحب کو گروہی تعصبات سے بلند ہو کر پاکستان کے ہر شہری کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف پاکستان کے ہر شہری کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسی اختلافات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پاکستان کی سالمیت کی خاطر صدر صاحب کا ہاتھ بٹائے۔

اس تعاون کے یُوں تو متعدد میدان ہیں مگر چند میدان ایسے ہیں جن میں یہ تعاون بالکل ناگزیر ہے۔ ان میدانوں میں کرنے کے جو مختلف کام ہیں۔ انہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّلین توجّہ کے کام جنہیں ایک لحظہ ضائع کیے بغیر جلد از جلد سر انجام دینا چاہیے۔ دوسرے وہ کام جو ملک کی تعمیرِ نو میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے اِن کاموں کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر صدرِ مملکت سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ ان ضروری کاموں کی تکمیل میں اُن سے کس طرح تعاون

کیا جا سکتا ہے۔

اوّلین توجہ کے جو کام صدرِ محترم کے پیشِ نظر ہیں یا فی الحقیقت ہونے چاہییں اُن میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں ظلم و تشدد کو بند کروایا جائے اور اُن بدنصیب لوگوں کی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کا کوئی موثر انتظام کیا جاتے جو بیچارے اسلام کے تصورِ قومیت کے علمبردار ہونے کی وجہ سے پاکستان کے پُرجوش حامی اور بنگلہ قومیت کے مخالف ہیں اور جنہوں نے اس مقصد کی خاطر کسی بڑی سے بڑی قربانی دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ یہ بےکس لوگ جن میں بنگالی اور غیر بنگالی دونوں شامل ہیں۔ اور جن کی تعداد لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں سے متجاوز ہے۔ ان پر اس وقت ناقابلِ بیان مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ ان بدنصیبوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بنگلہ قومیت کے دیوانوں اور اُن کی پشت پناہی کرنے والی بھارتی سینا کے ہاتھوں اپنے خاندانوں کو برباد ہوتے دیکھا ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ مغربی پریس کے ذریعے سفاکی اور بہیمیت کی جو روح فرسا خبریں آرہی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم بنگال کی سرزمین میں چُن چُن کر اُن لوگوں کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جن پر اسلام سے وابستگی اور پاکستان سے تعلق کا شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ بھارت کے پیشِ نظر اس وقت سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ان حضرات کا نام و نشان مٹا دیا جائے جو مستقبل قریب یا بعید میں مسلم قومیت کے تصوّر کو کبھی اُجاگر کر سکتے ہیں۔ اس وقت بلاشبہ بنگالیوں کی اچھی خاصی تعداد کے سر میں بنگلہ قومیت کا سودا سمایا ہوا ہے لیکن جلد ہی جب اس کے تلخ نتائج سامنے آنے کی وجہ سے اصل حقیقت اُن پر منکشف ہونے لگے گی اور بھارت اور روس اپنی معاونت اور دستگیری کی اس خطر سے بھاری قیمت وصول کرنے لگیں گے تو اس وقت اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ مسلم بنگال میں اسلام کے تصورِ قومیت کے دھندلے نقوش پھر سے روشن ہونے لگیں۔ اس خدشہ کو بھارت ابھی سے بھانپ کر اس امر کی پُوری کوشش کر رہا ہے کہ جن طبقوں کے اندر اس تصور کی دبی ہوئی چنگاریوں کے موجود ہونے کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں، ان طبقوں کو یکسر نیست و نابود کر دیا جائے۔

بھارت کی یہ سازش کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ اسے محض ایک موہوم خطرہ کہہ کر ٹال دیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں اسلام کے علمبرداروں پر جو کچھ بیت رہی ہے، اُسے دیکھتے ہوتے اس کے ناپاک عزائم کا اچھی

طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں حکومت کو سب سے زیادہ توجہ ان مظلوموں کی دادرسی کی طرف کرنی چاہیے اور بھارت کو اس بات پر مجبور کر دینا چاہیے کہ وہ نسل کشی کی اس مہم کو روک دے۔ ان ستم کشتوں کا اس کے علاوہ اور کوئی جرم نہیں کہ یہ اسلام کے تصوّرِ قومیت پر ایمان رکھنے کی وجہ سے پاکستان کے حصے بخرے کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان لوگوں کے ایثار اور خلوص اور اُن کی مظلومیت کو بھلا دینا خدا اور خلق دونوں کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ صدر محترم اس سلسلے میں جو اقدام بھی کریں پوری قوم ان کی مؤید اور حامی ہوگی اور اُن کے اس کارنامے کو دل کی گہرائیوں سے ایک عظیم کارنامہ تسلیم کرے گی۔ کوئی بدنصیب شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو اس معاملے میں اُن سے تعاون کرنے میں ذرا بھی متامل ہو۔

صدر محترم کو جس دوسرے کام کی طرف جلد از جلد توجہ دینی چاہیے وہ جمہوریت کی بحالی ہے۔ وہ خود آمریت اور مارشل لا کی تباہ کاریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اس آمرانہ نظام اور فوج کے تسلّط نے ملک کو کس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ صدر صاحب کو اس ضمن میں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اس طرزِ حکومت کے ضرر رساں پہلوؤں کی طرف خود بار بار اشارہ کر چکے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بھی کسی طرح مخفی نہیں کہ مارشل لا کی وجہ سے فوج اپنے اصل فرائض سے غافل ہو کر ایسے کاموں میں اُلجھ جاتی ہے جو اس کے کرنے کے کام نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ نوکر شاہی کی قباحتیں بھی اُس کے اندر سرایت کرنے لگتی ہیں اور وہ ملک کے دفاع کا مقدس فرض سر انجام دینے کے بجائے سیاسی دھڑے بندیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

پھر صدر محترم سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ آمریت محلاتی سازشوں کو جنم دیتی اور انہیں پروان چڑھاتی ہے۔ جس ملک میں بھی اس کے منحوس سائے پڑتے ہیں وہ ملک سازشوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ وہاں کے عوام کی حیثیت حکمران ٹولے کے نزدیک تاش کے پتوں کی سی ہوتی ہے جنہیں وہ جس طرح چاہتا ہے، کھیلتا ہے۔ اور ان پتوں کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ انہیں کس غرض کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اُن پر حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب کھیل کا فیصلہ ہو چکتا ہے۔ صاحبِ صدر اس بات سے اتفاق فرمائیں گے کہ اس ملک کے عوام کے ساتھ اس کے حکمرانوں نے گذشتہ پندرہ سالوں میں بڑے شرمناک کھیل کھیلے ہیں۔ انہوں نے

بڑے نازک سے نازک مراحل ہیں جب قوم اور ملک کی قسمت کے فیصلے ہو رہے تھے انہیں اصل حالات سے بالکل بے خبر رکھا اور ان بے چاروں کو صحیح صورتِ حال اس وقت معلوم ہوتی جب اُن کی قسمت کا فیصلہ مقدر کی صورت بن کر اُن کے سامنے آچکا تھا۔ اگر اس ملک میں جمہوری نظام رائج ہوتا اور ہر قدم اٹھانے سے پہلے اس پر بحث و تمحیص کی اجازت ہوتی اور عوام کو اعتماد میں لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی تو یہ قوم اس بربادی سے دوچار نہ ہوتی جس سے کہ وہ اس وقت دوچار ہوئی ہے۔ حکومت کا مقصد خاص نظریے اور خاص معیار اور مخصوص اقدارِ حیات کے مطابق عوام کی فلاح و بہبود کا حصول ہوتا ہے۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ کوئی حکومت اس صاف اور سیدھے مقصد کے حصول کے لیے سعی و جہد کرنے کے بجائے عوام کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ بھٹو صاحب کا قوم پر یہ بڑا احسان ہوگا کہ اگر وہ جمہوریت کی پٹڑی سے اُتری ہوئی اس بدنصیب قوم کی گاڑی کو پھر سے جمہوریت کی پٹڑی پر ڈال دیں۔ وہ اس کام کو اگر چاہیں تو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں کیونکہ وہ عوامی نمائندوں کے قائد کی حیثیت سے تختِ اقتدار پر متمکن ہوئے ہیں۔ اس اقتدار اور مقبولیت کے ہوتے ہوئے بھی اگر وہ اس کام میں ناکام رہے تو پھر یہاں جمہوریت کی بحالی کی کوئی توقع بظاہر باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ اگر عوامی ووٹوں سے منتخب ہونے والا شخص بھی عوامی احتساب سے گریز کرے اور امورِ مملکت کو چلانے کے لیے مارشل لا کے ضابطوں کا سہارا لینے پر مجبور رہو تو پھر فوجی آمروں سے تو اس بات کی امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ فوج کی مدد سے عوام کی گردنوں پر مسلط ہونے کے بعد اپنے افعال و اعمال کے معاملے میں عوام کے سامنے جوابدہ ہونے پر راضی ہو سکیں گے۔ اُن کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز رہے گی کہ کسی طرح فوج کی تائید ہر حال میں انہیں حاصل رہے، کیونکہ وہی ان کے اقتدار کی محافظ اور اُن کی قوت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ فوجی آمریت کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کوئی قوم اس میں ایک مرتبہ گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس چکر سے بمشکل نکلتی ہے۔ آمر بلاشبہ ادلتے بدلتے رہتے ہیں مگر آمریت کی جگہ جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہاں ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ فوج کے سربراہوں نے کسی عوامی نمائندے کو اقتدار منتقل کر دیا ہے۔ صدر بھٹو صاحب کو اس موقع کو غنیمت جان کر اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے اور فوجی آمریت کی زخم خوردہ قوم کے اندر جمہوریت بحال کر کے نہ صرف اس کے زخموں کے اندمال کا سامان کرنا چاہیے بلکہ اس کے کھوئے ہوئے حقوق عطا کر کے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش

کرنی چاہیے۔ یہ کام جتنی جلدی کر لیا جائے اسی قدر ملک و قوم، اصحاب اقتدار اور فوج کے لیے بہتر ہوگا، اور اس میں جس قدر تاخیر کی جائے گی اسی نسبت سے حالات نہ صرف صدر صاحب کے لیے پیچیدہ ہوتے چلے جائیں گے بلکہ اُن کی گرفت سے باہر ہو جائیں گے۔ اور پھر وہ بے بسی کے عالم میں جمہوریت کی خواہش کے باوجود اس معاملے میں کوئی مؤثر اقدام نہ کر سکیں گے۔

انہیں اس بات کا اطمینان رکھنا چاہیے کہ قوم کی فلاح کے لیے وہ جو انقلابی قدم بھی اٹھائیں گے قوم ان کی تائید کرے گی بشرطیکہ اُسے ان اقدامات کے روشن پہلوؤں سے آگاہ کر دیا جائے۔ صاحب صدر جب قوم کے لیے نیک عزائم رکھتے ہیں تو وہ ان عزائم کی تکمیل کے لیے تاریکی کا راستہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ وہ کیوں وہ راستہ اختیار نہیں کرتے جو تاریخ میں روشن شاہراہ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس پر اچھے کام کرنے والے ہمیشہ گامزن رہے ہیں۔ انہیں یہ مقدس کام دن کی روشنی میں کرنے چاہییں تاکہ عوام اُن کی قدر و قیمت اچھی طرح متعین کر کے صاحب صدر کے شکر گزار ہو سکیں۔

پھر جمہوریت کو بحال کر کے وہ فوج پر بھی بہت بڑا احسان کریں گے کیونکہ ان کے اس اقدام سے فوج کے کندھوں سے بہت سے ایسے بوجھ اُتر جائیں گے جو فوجی آمروں نے اس پر خواہ مخواہ ڈال رکھے تھے۔ کسی ملک کی فوج بنیادی طور پر اس کے دفاع کے لیے تیار کی جاتی اور اسی ایک مقصد کے پیش نظر اُس کی ایک انداز پر تربیت ہوتی ہے۔ یہ ملک اور فوج دونوں کی بدقسمتی ہے کہ دفاع وطن سے سپاہ کی توجہ ہٹا کر اُسے ایسے کاموں پر مامور کر دیا جائے جس کا اُسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اس سے ملک کے اندر دہشت اور خوف و ہراس کی فضا تو بلاشبہ پیدا ہو جاتی ہے۔ جس میں آمر بغیر کسی خوف یا ڈر کے من مانی کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ مگر فوج کو اپنے اصل کام سے ہٹا کر دوسرے کاموں میں مصروف رکھنے سے اس کی استعداد کار کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک کی فوج کا معیار انتظامی معاملات میں عرصہ دراز تک دخیل رہنے کے باوجود اُتنا نہیں گرا جتنا کہ عام طور پر گر جاتا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہماری سپاہ کا بیشتر حصہ ان بُرائیوں سے ابھی تک پاک ہے جو اس قسم کے حالات میں اس کے اندر راہ پا لیتی ہیں مگر جرنیلوں کی کھیپ کو صاحب صدر نے جس انداز سے سبکدوش کیا ہے اُس سے یہ تلخ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ہماری فوج کا معیار اب ایسا قابل رشک نہیں رہا جو کبھی پہلے تھا۔ اور انتظامی ذمہ داریوں سے اگر اُسے فارغ کر کے

یکسوئی کے ساتھ جنگی تربیت حاصل کرنے اور عسکری صلاحیتیں بروئے کار لانے کے پورے پورے مواقع فراہم نہ کیے گئے تو اس کا معیار اتنا گر جائے گا کہ اس کی تلافی ممکن نہ ہوگی اس لیے ملکی مفاد کا اولین تقاضا یہ ہے کہ مارشل لا کو ختم کر کے فوج کو اپنے اصل کام میں مصروف کر دیا جائے۔

اگر شیخ مجیب الرحمٰن صاحب غیر معمولی مصائب میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود مارشل لا سے بے نیاز ہو کر جمہوریت کی راہ اختیار کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ صدر بھٹو صاحب ایسا نہ کر سکیں؟ مغربی پاکستان میں صورتِ حال مشرقی پاکستان سے زیادہ سنگین نہیں۔ اس اقدام سے اُن کی عزت بھی بڑھ جائے گی اور پاکستان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے میں مدد بھی ملے گی۔ صدر محترم اس حقیقت سے ہم سے زیادہ واقف ہیں کہ پاکستان کے خلاف ہمارے دشمنوں نے معاندانہ پراپیگنڈے کی جو ناپاک مہم مدت سے شروع کر رکھی ہے اس میں بار بار اس بات کو اچھالا جاتا ہے کہ ہمارا ملک زمین بے آئین ہے۔ مارشل لا کو مہذب دنیا نے کبھی بھی آئین کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا بلکہ اسے ہمیشہ آئین کی نفی بلکہ تذلیل اور انسانی حقوق پر ڈاکہ تصور کیا ہے۔ اس بنا پر جس ملک میں مارشل لا نافذ کیا جاتا ہے انسانی برادری میں اس کی ساکھ گر جاتی ہے۔ اس لیے ملکی وقار کا یہ عین تقاضا ہے کہ اس مقدس سرزمین سے مارشل لا کو جلد از جلد رخصت کیا جائے اور اس زمین بے آئین کو پھر سے آئین عطا کیا جائے۔ آئین کے نفاذ کا مسئلہ بھی اتنا پیچیدہ نہیں جتنا کہ اسے بنا دیا گیا ہے۔ جس آئین کو منسوخ کر کے ملک میں مارشل لا نافذ کیا گیا تھا اسی آئین کو مارشل لا کے خاتمے کے ساتھ ہی خود بخود بحال ہو جانا چاہیے۔ یہ چیز عقل اور انصاف کے عین مطابق ہے۔ پھر یہ آئین بھی ایسا ہے جسے پوری قوم نے بعض جزوی اختلافات کے باوجود قبول کر لیا تھا اور اُس کی بنیاد پر انتخابات ہونے والے تھے کہ سکندر مرزا صاحب نے ملک پر مارشل لا مسلط کر کے اسے منسوخ کر دیا۔

صدر صاحب کی توجہ کے مستحق کاموں میں ایک بڑا کام نظم و نسق کی ناقابلِ بیان حد تک خرابی کا مسئلہ بھی ہے۔ غنڈہ عناصر کھلے بندوں دندناتے پھر رہے ہیں اور کوئی ان کا محاسبہ کرنے والا نظر نہیں آتا۔ چونکہ ان عناصر کی اچھی خاصی تعداد کو پچھلے انتخابات میں حکمراں پارٹی کے بعض افراد نے استعمال کیا (باقی ص ۲۵ پر)

تفہیم القرآن

اللّیل

نام پہلے ہی لفظ واللیل کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون سورۂ شمس سے اِس قدر مشابہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ہی بات ہے جسے سورۂ شمس میں ایک طریقہ سے سمجھایا گیا ہے اور اِس سورہ میں دوسرے طریقے سے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا اختلاف بیان کرنا ہے۔ مضمون کے لحاظ سے یہ سورۃ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ آغاز سے آیت ۱۱ تک ہے، اور دوسرا حصہ آیت ۱۲ سے آخر تک۔

پہلے حصے میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد، اقوام اور گروہ دنیا میں جو سعی و عمل بھی کر رہے ہیں، وہ لازماً اپنی اخلاقی نوعیت کے لحاظ سے اُسی طرح مختلف ہیں، جس طرح دن رات سے اور نر مادہ سے مختلف ہے۔ اِس کے بعد قرآن کی مختصر سورتوں کے عام اندازِ بیان کے مطابق تین اخلاقی خصوصیات ایک نوعیت کی، اور تین اخلاقی خصوصیات دوسری نوعیت کی سعی و عمل کے ایک وسیع مجموعے میں سے لے کر بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جنہیں سن کر ہر شخص بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک قسم کی خصوصیات کس طرزِ زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں اور دوسری قسم کی خصوصیات اُس کے برعکس کس دوسرے طرزِ زندگی کی علامات ہیں۔ یہ دونوں نمونے ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت چچے تُلے فقروں میں بیان کیے گئے ہیں کہ سنتے ہی آدمی کے دل میں اُتر جائیں اور زبان پر چڑھ جائیں۔ پہلی قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ آدمی مال دے، خدا ترسی و

پرہیزگاری اختیار کرے اور بھلائی کو بھلائی مانے۔ دوسری قسم کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بخل کرے، خدا کی رضا اور ناراضی کی فکر سے بے پروا ہو جائے اور بھلی بات کو جھٹلا دے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ یہ دو طرزِ عمل جو صریحاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اپنے نتائج کے اعتبار سے ہرگز یکساں نہیں ہیں، بلکہ جس قدر یہ اپنی نوعیت میں متضاد ہیں اسی قدر ان کے نتائج بھی متضاد ہیں۔ پہلے طرزِ عمل کو جو شخص یا گروہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے صاف اور سیدھے راستے کو سہل کر دیگا یہاں تک کہ اس کے لیے نیکی کرنا آسان اور بدی کرنا مشکل ہو جائے گا اور دوسرے طرزِ عمل کو جو بھی اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے زندگی کے بکٹ اور سخت راستے کو سہل کر دیگا یہاں تک کہ اس کے لیے بدی آسان اور نیکی مشکل ہو جائے گی۔ اِس بیان کو ایک نہایت مؤثر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے جملے پر ختم کیا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال جس کے پیچھے آدمی جان دیے دیتا ہے، آخر قبر میں تو اُس کے ساتھ جانے والا نہیں ہے، مرنے کے بعد یہ اُس کے کس کام آئے گا؟

دوسرے حصے میں بھی اِسی اختصار کے ساتھ تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے دنیا کی اِس امتحان گاہ میں انسان کو بے خبر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اُس نے یہ بتا دینا اپنے ذمّہ لیا ہے کہ زندگی کے مختلف راستوں میں سے سیدھا راستہ کونسا ہے۔ اِس کے ساتھ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اپنا رسول اور اپنی کتاب بھیج کر اُس نے اپنی یہ ذمہ داری ادا کر دی ہے، کیونکہ رسولؐ اور قرآنؑ دونوں ہدایت دینے کے لیے سب کے سامنے موجود تھے۔ دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مالک اللہ ہی ہے۔ دنیا مانگو گے تو وہ بھی اسی سے ملے گی اور آخرت مانگو گے تو اُس کا دینے والا بھی وہی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا تمہارا اپنا کام ہے کہ تم اُس سے کیا مانگتے ہو۔ تیسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ جو بدبخت اُس بھلائی کو جھٹلائے گا جسے رسول اور کتاب کے ذریعہ سے پیش کیا جا رہا ہے، اور اُس سے منہ پھیرے گا اُس کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار ہے۔ اور جو خدا ترس آدمی پوری بے غرضی کے ساتھ محض اپنے رب کی رضا جوئی کی خاطر اپنا مال راہِ خیر میں صرف کرے گا اس کا رب اُس سے راضی ہوگا اور اسے اتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے، اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو، اور اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا، درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں[۱]۔ تو جس نے (راہِ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا[۲]، اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دینگے[۳]۔ اور

---

[۱] یہ وہ بات ہے جس پر رات اور دن اور نر و مادہ کی پیدائش کی قسم کھائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح رات اور دن اور نر اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ان میں سے ہر دو کے آثار و نتائج باہم متضاد ہیں، اسی طرح تم لوگ جن راہوں اور مقاصد میں اپنی کوششیں صرف کر رہے ہو وہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اور اپنے نتائج کے اعتبار سے متضاد ہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں بتایا گیا کہ یہ تمام مختلف کوششیں دو بڑی اقسام میں تقسیم ہوتی ہیں:

[۲] یہ انسانی مساعی کی ایک قسم ہے جس میں تین چیزیں شمار کی گئی ہیں اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام خوبیوں کی جامع ہیں۔ ایک یہ کہ انسان زرپرستی میں مبتلا نہ ہو بلکہ کھلے دل سے اپنا مال، جتنا کچھ بھی اللہ نے اُسے دیا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں، اور خلقِ خدا کی مدد کرنے میں صرف کرے۔ دوسرے یہ کہ اُس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور وہ اخلاق، اعمال، معاشرت، معیشت، غرض اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اُن کاموں سے پرہیز کرے جو خدا کی ناراضی کے موجب ہوں۔ تیسرے یہ کہ وہ بھلائی کی تصدیق کرے۔ بھلائی ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے جس میں عقیدے، اخلاق اور اعمال، تینوں کی بھلائی شامل ہے۔ عقیدے میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی شرک اور دہریت اور کفر کو چھوڑ کر توحید، آخرت اور رسالت کو برحق مانے۔ اور اخلاق و اعمال میں بھلائی کی تصدیق یہ ہے کہ آدمی سے بھلائیوں کا صدور محض بے شعوری کے ساتھ کسی متعین نظام کے بغیر نہ ہو رہا ہو، بلکہ وہ خیر و صلاح کے اُس نظام کو صحیح تسلیم کرے جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے، جو بھلائیوں کو اُن کی تمام اشکال اور صورتوں کے ساتھ ایک نظم میں منسلک کرتا ہے، جس کا جامع نام شریعتِ الٰہیہ ہے۔

[۳] یہ ہے مساعی کی اِس قسم کا نتیجہ۔ آسان راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے، جو اُس خالق کی مرضی کے مطابق ہے جس نے انسان کو اور ساری کائنات کو بنایا ہے، جس میں انسان کو اپنے ضمیر سے لڑ کر نہیں چلنا پڑتا، جس میں انسان اپنے جسم و جان اور عقل و ذہن کی قوتوں پر زبردستی کرکے اُن سے وہ کام نہیں لیتا جس کے لیے یہ طاقتیں اُس کو نہیں بخشی گئی ہیں بلکہ وہ کام لیتا ہے جس کے لیے درحقیقت یہ اُس

کو بخشی گئی ہیں، جس میں انسان کو ہر طرف اُس جنگ، مزاحمت اور کشمکش سے سابقہ پیش نہیں آتا جو گناہوں سے بھری ہوئی زندگی میں پیش آتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے میں ہر قدم پر اس کو صلح و آشتی اور قدر و منزلت میسر آتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو آدمی اپنا مال خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے استعمال کر رہا ہو، جو ہر ایک سے نیک سلوک کر رہا ہو، جس کی زندگی جرائم، فسق و فجور اور بدکرداری سے پاک ہو، جو اپنے معاملات میں کھرا اور راست باز ہو، جو کسی کے ساتھ بے ایمانی، بدعہدی اور بے وفائی نہ کرے، جس سے کسی کو خیانت، ظلم اور زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، جو ہر شخص کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور کسی کو اس کی سیرت و کردار پر انگلی رکھنے کا موقع نہ ملے، وہ خواہ کیسے ہی بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتا ہو، بہرحال اُس کی قدر ہو کر رہتی ہے، اُس کی طرف دل کھنچتے ہیں، نگاہوں میں اُس کی عزت قائم ہو جاتی ہے، اُس کا اپنا قلب و ضمیر بھی مطمئن ہوتا ہے اور معاشرے میں بھی اس کو وہ وقار حاصل ہوتا ہے جو کبھی کسی بدکردار آدمی کو حاصل نہیں ہوتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ نحل میں فرمائی گئی ہے کہ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ؕ "جو شخص نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، اسے ہم اچھی زندگی بسر کرائیں گے" (آیت ۹۷)۔ اور اسی بات کو سورۂ مریم میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا "یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے رحمان اُن کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا" (آیت ۹۶)۔ پھر یہی وہ راستہ ہے جس میں دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کے لیے سرور ہی سرور اور راحت ہی راحت ہے۔ اِس کے نتائج عارضی اور وقتی نہیں بلکہ ابدی اور لازوال ہیں۔

اِس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ہم اُسے اِس راستے پر چلنے کے لیے سہولت دیں گے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ بھلائی کی تصدیق کر کے یہ فیصلہ کرے گا کہ یہی راستہ میرے لائق ہے اور بُرائی کا راستہ میرے لائق نہیں ہے، اور جب وہ عملاً مالی ایثار اور تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے یہ ثابت کر دے گا کہ اُس کی یہ تصدیق سچی ہے، تو اللہ تعالیٰ اِس راستے پر چلنا اُس کے لیے سہل کر دے گا۔ اُس کے لیے پھر گناہ کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائیگا۔ مالِ حرام اُس کے سامنے آئے گا تو وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ نفع کا سودا ہے بلکہ اُسے یُوں محسوس ہو گا کہ یہ آگ کا انگارہ ہے جسے وہ ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ بدکاری کے مواقع اس کے سامنے آئیں گے تو وہ انہیں لُطف اور لذت حاصل کرنے کے مواقع سمجھ کر ان کی طرف نہیں لپکے گا بلکہ جہنم کے دروازے سمجھ کر اُن سے دُور بھاگے گا۔ نماز اُس پر گراں نہ ہو گی بلکہ اُسے چین نہیں پڑے گا جب تک وقت آنے پر وہ اس کو ادا نہ کرلے۔ زکوٰۃ دیتے ہوئے اس کا دل نہیں دُکھے گا

جس نے بُخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا،[۴] اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے،[۵] اور اس کا مال آخر اُس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے؟[۶]

بلکہ اپنا مال اُسے ناپاک محسوس ہوگا جب تک وہ اس میں سے زکوٰۃ نکال نہ دے۔ غرض ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو اِس راستے پر چلنے کی توفیق و تائید ملے گی، حالات کو اُس کے لیے سازگار بنایا جائے گا، اور اُس کی مدد کی جائے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس سے پہلے سُورۂ بلد میں اِسی راستے کو دُشوار گزار گھاٹی کہا گیا ہے اور یہاں اس کو آسان راستہ قرار دیا گیا ہے۔ اِن دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اِس راہ کو اختیار کرنے سے پہلے یہ آدمی کو دشوار گزار گھاٹی ہی محسوس ہوتی ہے جس پر چڑھنے کے لیے اُسے اپنے نفس کی خواہشوں سے، اپنے دنیا پرست اہل و عیال سے، اپنے رشتہ داروں سے، اپنے دوستوں اور معاملہ داروں سے، اور سب سے بڑھ کر شیطان سے لڑنا پڑتا ہے، کیونکہ ہر ایک اس میں رکاوٹیں ڈالتا ہے اور اس کو خوفناک بنا کر دکھاتا ہے۔ لیکن جب انسان بھلائی کی تصدیق کرکے اس پر چلنے کا عزم کر لیتا ہے اور اپنا مال راہِ خدا میں دے کر اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کرکے عملاً اِس عزم کو پختہ کر لیتا ہے تو اِس گھاٹی پر چڑھنا اس کے لیے آسان اور اخلاقی پستیوں کے کھڈ میں لڑھکنا اُس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

[۴] یہ انسانی مساعی کی دوسری قسم ہے جو اپنے ہر جُز میں پہلی قسم کے ہر جُز سے مختلف ہے۔ بُخل سے مراد محض وہ بُخل نہیں ہے جس کے لحاظ سے عام طور پر لوگ اُس آدمی کو بخیل کہتے ہیں جو روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھتا ہے اور اسے نہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ اِس جگہ بُخل سے مُراد راہِ خدا میں اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال صرف نہ کرنا ہے اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنی ذات پر، اپنے عیش و آرام پر، اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر تو خوب دل کھول کر مال لُٹاتا ہے، مگر کسی نیک کام کے لیے اس کی جیب سے کچھ نہیں نکلتا، یا اگر نکلتا بھی ہے تو یہ دیکھ کر نکلتا ہے کہ اس کے بدلے میں اسے شہرت، نام و نمود، حُکّام رسی، یا کسی اور قسم کی منفعت حاصل ہوگی۔ بے نیازی برتنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مادّی فائدوں ہی کو اپنی ساری تگ و دو اور محنت و کوشش کا مقصود بنائے اور خدا سے بالکل مستغنی ہو کر اس بات کی کچھ پروا نہ کرے کہ کس کام سے وہ خوش اور کس کام سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ رہا بھلائی کو جھٹلانا، تو وہ اپنی تمام تفصیلات میں بھلائی کو سچ ماننے کی ضد ہے، اس لیے اس کی تشریح کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھلائی کی تصدیق کا مطلب ہم واضح کر چکے ہیں۔

شہ اِس راستے کو سخت اس لیے کہا گیا ہے کہ اِس پر چلنے والا اگرچہ مادّی فائدوں اور دنیوی لذتوں اور ظاہری کامیابیوں کے لالچ میں اِس کی طرف جاتا ہے، لیکن اِس میں ہر وقت اپنی فطرت سے، اپنے ضمیر سے، خالقِ کائنات کے بنائے ہوئے قوانین سے، اور اپنے گرد و پیش کے معاشرے سے اُس کی جنگ برپا رہتی ہے۔ صداقت، دیانت، امانت، شرافت، اور عفت و عصمت کی اخلاقی حدوں کو توڑ کر جب وہ ہر طریقے سے اپنی اغراض اور خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب اس کی ذات سے خلقِ خدا کو بھلائی کے بجائے بُرائی ہی پہنچتی ہے، اور جب وہ دوسروں کے حقوق اور ان کی عزتوں پر دست درازیاں کرتا ہے، تو اپنی نگاہ میں وہ خود ذلیل و خوار ہوتا ہے اور جس معاشرے میں وہ رہتا ہے اُس سے بھی قدم قدم پر لڑ کر اسے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ کمزور ہو تو اِس روش کی بدولت اُسے طرح طرح کی سزائیں بھگتنی ہوتی ہیں، اور اگر وہ مالدار، طاقتور اور با اثر ہو، تو چاہے دنیا اُس کے زور کے آگے دب جائے لیکن کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی، عزت اور محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اُس کے شریکِ کار بھی اس کو ایک خبیث آدمی ہی سمجھتے ہیں۔ اور یہ معاملہ صرف افراد ہی تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتور قومیں بھی جب اخلاق کے حدود پھاند کر اپنی طاقت اور دولت کے زعم میں بدکرداری کا رویہ اختیار کرتی ہیں، تو ایک طرف باہر کی دنیا اُن کی دشمن ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف خود اُن کا اپنا معاشرہ جرائم، خودکشی، نشہ بازی، امراضِ خبیثہ، خاندانی زندگی کی تباہی، نوجوان نسلوں کی بدراہی، طبقاتی کشمکش، اور ظلم و جور کی روز افزوں وبا سے دوچار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بامِ عروج سے گرتی ہے تو دنیا کی تاریخ میں اپنے لیے لعنت اور پھٹکار کے سوا کوئی مقام چھوڑ کر نہیں جاتی۔

اور یہ جو فرمایا گیا کہ ایسے شخص کو ہم سخت راستے پر چلنے کی سہولت دیں گے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس سے بھلائی کے راستے پر چلنے کی توفیق سلب کر لی جائے گی، بُرائی کے دروازے اُس کے لیے کھول دیے جائیں گے، اُسی کے اسباب اور وسائل اس کے لیے فراہم کر دیے جائیں گے، بدی کرنا اس کے لیے آسان ہو گا اور نیکی کرنے کے خیال سے اس کو یوں محسوس ہو گا کہ جیسے اس کی جان پر بن رہی ہے۔ یہی کیفیت ہے جسے دوسری جگہ قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی اُسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے) جیسے اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے" (الانعام، آیت ۱۲۵)۔ ایک اور جگہ ارشاد ہُوا ہے "بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے مگر فرمانبر

بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے،[۸] اور درحقیقت آخرت اور دنیا، دونوں کے ہم ہی مالک ہیں[۹] لیکن

بندوں کے لیے نہیں" (البقرہ، آیت ۲۶۴)۔ اور منافقین کے متعلق فرمایا "وہ نماز کی طرف آتے بھی ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کرتے بھی ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں" (التوبہ، آیت ۵۴)۔ اور یہ کہ "ان میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہِ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اُسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں" (التوبہ، آیت ۹۸)۔

[۷] دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ایک روز اُسے بہرحال مرنا ہے اور وہ سب کچھ دُنیا ہی میں چھوڑ جانا ہے جسے اُس نے یہاں اپنے عیش کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگر اپنی آخرت کے لیے کچھ کما کر وہ ساتھ نہ لے گیا تو یہ مال اس کے کس کام آئے گا؟ قبر میں تو وہ کوئی کوٹھی، کوئی موٹر، کوئی جائداد اور کوئی جمع پونجی لے کر نہیں جائے گا۔

[۸] یعنی انسان کا خالق ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حکمت، اپنے عدل اور اپنی رحمت کی بنا پر اِس بات کا ذمہ لیا ہے کہ اُس کو دنیا میں بے خبر نہ چھوڑے بلکہ اُسے یہ بتا دے کہ راہِ راست کونسی ہے اور غلط راہیں کونسی، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، حلال کیا ہے اور حرام کیا، کونسی روش اختیار کرکے وہ فرمانبردار بندہ بنے گا اور کونسا رویّہ اختیار کرکے بندۂ نافرمان بن جائے گا۔ یہی بات ہے جسے سورۂ نحل میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (آیت ۹)، "اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں" (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۹)۔

[۹] اس ارشاد کے کئی مفہوم ہیں اور وہ سب صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا سے آخرت تک تم کہیں بھی ہماری گرفت سے باہر نہیں ہو، کیونکہ دونوں جہانوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری ملکیت دنیا اور آخرت دونوں پر بہرحال قائم ہے خواہ تم ہماری بتائی ہوئی راہ پر چلو یا نہ چلو۔ گمراہی اختیار کروگے تو ہمارا کچھ نہ بگاڑوگے، اپنا ہی نقصان کرلوگے، اور راہِ راست اختیار کروگے تو ہمیں کوئی نفع نہ پہنچاؤگے، خود ہی اس کا نفع اٹھاؤگے۔ تمہاری نافرمانی سے ہماری مِلک میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی اور تمہاری نافرمانی سے اُس میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ تیسرے یہ کہ دونوں جہانوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ دنیا چاہوگے تو وہ بھی ہم ہی سے ملے گی اور آخرت کی بھلائی چاہوگے تو اُس کا دینا بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے۔ یہی بات ہے جو سورۂ آلِ عمران آیت ۱۴۵ میں فرمائی گئی ہے کہ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا، "جو شخص ثوابِ دنیا کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے اور

مَیں نے تم کو خبردار کر دیا ہے بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اُس میں نہیں جھلسے گا مگر وہ انتہائی بدبخت جس نے جھٹلایا اور مُنہ پھیرا۔ اور اُس سے دُور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۹ اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے ربِّ برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے۱۰۔ اور ضرور وہ (اُس سے) خوش ہوگا۱۱۔ ع

جو ثوابِ آخرت کے ارادہ سے کام کرے گا اس کو ہم آخرت میں سے دینگے"۔ اور اسی کو سُورۂ شوریٰ آیت ۲۰ میں اِس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ "جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے"۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، آل عمران، حاشیہ ۱۰۵۔ جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۳۷)۔

۹ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نہایت شقی کے سوا کوئی آگ میں نہ جائے گا اور نہایت متقی کے سوا کوئی اس سے نہ بچے گا۔ بلکہ یہاں مقصود دو انتہائی متضاد کرداروں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کر کے اُن کا انتہائی متضاد انجام بیان کرنا ہے۔ ایک وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو جھٹلا دے اور اطاعت کی راہ سے منہ پھیر لے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو نہ صرف ایمان لائے بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ کسی ریاکاری اور نام و نمود کی طلب کے بغیر صرف اس لیے اپنا مال راہِ خدا میں صرف کرے کہ وہ اللہ کے ہاں پاکیزہ انسان قرار پانے کا خواہاں ہے۔ یہ دونوں کردار اُس وقت مکہ کے معاشرے میں سب کے سامنے موجود تھے۔ اس لیے کسی کا نام لیے بغیر لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ جہنم کی آگ میں دوسرے کردار والا نہیں بلکہ پہلے کردار والا ہی جھلسے گا، اور اُس آگ سے پہلے کردار والا نہیں بلکہ دوسرے کردار والا ہی دُور رکھا جائے گا۔

۱۰ یہ اُس پرہیزگار آدمی کے خلوص کی مزید توضیح ہے کہ وہ اپنا مال جن لوگوں پر صرف کرتا ہے اُن کا کوئی احسان پہلے سے اُس پر نہ تھا کہ وہ اُس کا بدلہ چکانے کے لیے، یا آئندہ اُن سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے اُن کو ہدیے اور تحفے دے رہا ہو اور اُن کی دعوتیں کر رہا ہو، بلکہ وہ اپنے ربِّ برتر کی رضا جوئی کے لیے ایسے لوگوں کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے اُس پر کوئی احسان تھا، نہ آئندہ ان سے وہ کسی احسان کی توقع رکھتا ہے۔ اِس کی بہترین مثال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ہے کہ مکۂ معظمہ میں جن بے کس غلاموں اور لونڈیوں نے اسلام قبول کیا تھا اور اِس قصور میں جن کے

مالک ان پر بے تحاشا ظلم توڑ رہے تھے، اُن کو خرید خرید کر وہ آزاد کر دیتے تھے تاکہ وہ اُن کے ظلم سے بچ جائیں۔ ابنِ جَریر اور ابنِ عَساکر نے حضرت عامر بن عبداللہ بن زُبیر کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح اُن غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیہ خرچ کرتے دیکھ کر اُن کے والد نے اُن سے کہا کہ بیٹا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کر رہے ہو۔ اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لیے قوت بازو بنتے۔ اِس پر حضرت ابوبکرؓ نے اُن سے کہا ای ابہ انما ارید ما عند اللہ "ابا جان، میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے"۔

لله اس آیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ ضرور اللہ اُس سے راضی ہو جائیگا۔ دوسرے یہ کہ عنقریب اللہ اس شخص کو اتنا کچھ دے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔

تفہیم القرآن

الضُّحیٰ

نام پہلے ہی لفظ والضُّحیٰ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک وحی کے نزول کا سلسلہ بند رہا تھا جس سے حضورؐ سخت پریشان ہوگئے تھے اور بار بار آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا جس کی وجہ سے میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ وحی کے نزول کا سلسلہ کسی ناراضی کی بنا پر نہیں روکا گیا تھا، بلکہ اس میں وہی مصلحت کارفرما تھی جو روزِ روشن کے بعد رات کا سکون طاری کرنے میں کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی وحی کی تیز روشنی اگر آپ پر برابر پڑتی رہتی تو آپ کے اعصاب اسے برداشت نہ کر سکتے، اس لیے بیچ میں وقفہ دیا گیا تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ یہ کیفیت حضورؐ پر نبوت کے ابتدائی دور میں گزرتی تھی جبکہ ابھی آپ کو وحی کے نزول کی شدت برداشت کرنے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ اِس بنا پر بیچ بیچ میں وقفہ دینا ضروری ہوتا تھا۔ اِس کی وضاحت ہم سورۂ مُدّثّر کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔ اور سورۂ مزّمّل حاشیہ ۵ میں ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ نزولِ وحی کا کس قدر شدید بار آپ کے اعصاب پر پڑتا تھا۔ بعد میں جب حضورؐ کے اندر اس بار کو برداشت کرنے کا تحمّل پیدا ہو گیا تو طویل وقفے دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

موضوع اور مضمون اِس کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے اور مقصد اُس پریشانی کو دُور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رُک جانے سے آپ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روزِ روشن

اور سکونِ شب کی قسم کھا کر آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دَور میں جن شدید مشکلات سے آپ کو سابقہ پیش آ رہا ہے یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ آپ کے لیے ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہوتا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی عطا و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی اُن صریح پیشنگوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں حرف بحرف پوری ہوئیں، حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اُس وقت کہیں دَور دُور بھی اِس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ مکہ میں جو بے یار و مددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ پیکار ہو گیا ہے اُسے اِتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہو گی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ تمہیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہو گئی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم تو تمہارے روزِ پیدائش سے مسلسل تم پر مہربانیاں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تم یتیم پیدا ہوتے تھے، ہم نے تمہاری پرورش اور خبر گیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم ناواقفِ راہ تھے، ہم نے تمہیں راستہ بتایا۔ تم نادار تھے، ہم نے تمہیں مالدار بنا دیا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتدا سے ہمارے منظورِ نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستقل طور پر تمہارے شاملِ حال ہے۔ اس مقام پر سورۂ طٰہٰ، آیات ۳۷ تا ۴۲ کو بھی نگاہ میں رکھا جاتے جہاں حضرت موسیٰ کو فرعون جیسے جبّار کے مقابلہ میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کی پریشانی دُور کرنے کے لیے اُنہیں بتایا ہے کہ کس طرح تمہاری پیدائش کے وقت سے ہماری مہربانیاں تمہارے شاملِ حال رہی ہیں، اس لیے تم اطمینان رکھو کہ اِس خوفناک مہم میں تم اکیلے نہ ہو گے بلکہ ہمارا فضل تمہارے ساتھ ہو گا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ جو احسانات ہم نے تم پر کیے ہیں ان کے جواب میں خلقِ خدا کے ساتھ تمہارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے، اور ہماری نعمتوں کا شکر تمہیں کس طرح ادا کرنا چاہیے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے روزِ روشن کی[1] اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے[2]۔ (اے نبیؐ) تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا[3]۔ اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے

---

[1] یہاں لفظ ضُحیٰ رات کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد روزِ روشن ہے۔ اس کی نظیر سورۂ اعراف کی یہ آیات ہیں: اَفَاَمِنَ اَھْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَھُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّھُمْ نَآئِمُوْنَ۔ اَوَاَمِنَ اَھْلُ الْقُرٰٓی اَنْ یَّاْتِیَھُمْ بَاْسُنَا ضُحًی وَّھُمْ یَلْعَبُوْنَ (۹۷-۹۸) "کیا بستیوں کے لوگ اس سے بےخوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آجائے جبکہ وہ سو رہے ہوں؟ اور کیا بستیوں کے لوگ اس سے بےخوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن دہاڑے آجائے جبکہ وہ کھیل رہے ہوں؟" ان آیات میں بھی چونکہ ضُحیٰ کا لفظ رات کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد چاشت کا وقت نہیں بلکہ دن ہے۔

[2] اصل میں رات کے لیے لفظ سَجیٰ استعمال ہوا ہے جس میں صرف تاریکی چھا جانے ہی کا نہیں بلکہ سکوت اور سکون طاری ہو جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ رات کی اس صفت کا اُس مضمون سے گہرا تعلق ہے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

[3] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا تھا۔ مختلف روایات میں یہ مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ ابن جُریج نے ۱۲ روز، کلبی نے ۱۵ روز، ابن عباسؓ نے ۲۵ روز، سُدّی اور مُقاتل نے ۴۰ روز اس کی مدت بیان کی ہے۔ بہرحال یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر سخت غمگین ہو گئے تھے اور مخالفین بھی آپ کو طعنے دینے لگے تھے۔ کیونکہ حضورؐ پر جو نئی سورۃ نازل ہوتی تھی اسے آپؐ لوگوں کو سنایا کرتے تھے، اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپ نے کوئی نئی وحی لوگوں کو نہیں سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ جُندَب بن عبداللہ البَجَلی کی روایت ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے آنے کا سلسلہ رُک گیا تو مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے رب نے چھوڑ دیا ہے (ابن جریر، طبرانی، عبد بن حُمَید، سعید بن منصور، ابن مَردُوْیَہ)۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کی بیوی امِّ جمیل نے، جو حضورؐ کی چچی ہوتی تھی اور جس کا گھر حضورؐ کے مکان سے متصل تھا، آپؐ سے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے شیطان نے

بہتر ہے، اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ کیا اُس نے تم کو یتیم نہیں پایا

نہیں چھوڑ دیا ہے"۔ عوفی اور ابن جریر نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ کئی روز تک جبریلؑ کی آمد رک جانے سے حضورؐ پریشان ہو گئے اور مشرکین کہنے لگے کہ ان کا رب ان سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ قتادہ اور ضحاک کی مُرسل روایات میں بھی قریب قریب یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اِس صورتِ حال میں حضورؐ کے شدید رنج و غم کا حال بھی متعدد روایات میں آیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ محبوب کی طرف سے بظاہر عدمِ التفات، کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اُسی ذریعۂ طاقت سے بظاہر محرومی جو اِس جاں گُسل کشمکش کے منجدھار میں آپؐ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اُس پر مزید دشمنوں کی شماتت، یہ ساری چیزیں مل جل کر لامحالہ حضورؐ کے لیے سخت پریشانی کی موجب ہو رہی ہوں گی اور آپ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہوگا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اِس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

اِسی کیفیت میں یہ سورۃ حضورؐ کو تسلی دینے کے لیے نازل ہوئی۔ اِس میں دن کی روشنی اور رات کے سکون کی قسم کھا کر حضورؐ سے فرمایا گیا کہ تمہارے رب نے نہ تمہیں چھوڑ دیا ہے اور نہ وہ تم سے ناراض ہُوا ہے۔ اِس بات پر اِن دونوں چیزوں کی قسم جس مناسبت سے کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون لیے ہوئے چھا جانا کچھ اِس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت اُن سے ناراض ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت و مصلحت کے تحت طاری ہوتی ہیں، اُسی طرح تم پر کبھی وحی بھیجنا اور کبھی اُس کو روک لینا بھی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہے، اِس کا کوئی تعلق اِس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم سے خوش ہو تو وحی بھیجے، اور جب وہ وحی نہ بھیجے تو اس کے معنی یہ ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ اِس کے علاوہ دوسری مناسبت اِس مضمون سے اِس قسم کی یہ ہے کہ جس طرح دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکا دے، اس لیے ایک وقتِ خاص تک دن کے روشن رہنے کے بعد رات کا آنا ضروری ہے تاکہ اس میں انسان کو سکون ملے، اُسی طرح وحی کی روشنی اگر تم پر پے در پے پڑتی رہے تو تمہارے اعصاب اس کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً فترۃ (نزولِ وحی کا سلسلہ رک جانے) کا ایک زمانہ بھی اللہ تعالیٰ نے مصلحت کی بنا پر رکھا ہے تاکہ وحی کے نزول سے جو بار تم پر پڑتا ہے اس کے اثرات زائل

اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟[۶] اور تمہیں ناواقفِ راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔[۷] اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا۔[۸]

ہو جائیں اور تمہیں سکون حاصل ہو جاتے۔ گویا آفتابِ وحی کا طلوع بمنزلۂ روزِ روشن ہے اور زمانۂ فترۃ بمنزلۂ سکونِ شب۔

[۴] یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مٹھی بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ کی مخالف تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اسلام کی شمع مکہ ہی میں ٹمٹما رہی تھی اور اُسے بجھا دینے کے لیے ہر طرف طوفان اٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپ ذرا پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپ کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزت و شوکت اور آپ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کا نفوذ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ اُس مرتبے سے بھی بدرجہا بڑھ کر ہوگا جو دنیا میں آپ کو حاصل ہوگا۔ طَبرانی نے اَوسط میں اور بیہقی نے دلائل میں ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میرے سامنے وہ تمام فتوحات پیش کی گئیں جو میرے بعد میری امت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے"۔

[۵] یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضورؐ کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا ملکِ عرب جنوب کے سواحل سے لے کر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لیکر مغرب میں بحرِ احمر تک آپ کے زیرِ نگیں ہو گیا، عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہو گئی، جو طاقت بھی اِس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی، کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے یہ پورا ملک گونج اٹھا جس کے مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضورؐ کی برپا کی ہوئی تحریک اِس طاقت کے ساتھ اُٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر وہ چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دنیا میں دیا، اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔

[۶] یعنی تمہیں چھوڑ دینے اور تم سے ناراض ہو جانے کا کیا سوال، ہم تو اُس وقت سے تم پر مہربان ہیں جب تم یتیم پیدا ہوئے تھے۔ حضورؐ ابھی بطنِ مادر ہی میں چھ مہینے کے تھے جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اس لیے آپ دنیا میں یتیم ہی کی حیثیت سے تشریف لائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دن بھی آپ کو بے سہارا نہ چھوڑا۔ چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ آپ کی پرورش کرتی رہیں۔ ان کی شفقت سے محروم ہوئے تو ۸ سال کی عمر تک آپ کے جدِامجد نے آپ کو اس طرح پالا کہ ان کو نہ صرف آپ سے غیر معمولی محبت تھی بلکہ اُن کو آپ پر فخر تھا اور وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا ایک دن دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ اُن کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ کے حقیقی چچا ابوطالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمے لی اور آپ کے ساتھ ایسی محبت کا برتاؤ کیا کہ کوئی باپ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ نبوت کے بعد جب ساری قوم آپ کی دشمن ہو گئی تھی اس وقت دس سال تک وہی آپ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔

[۷] اصل میں لفظ ضَالًّا استعمال ہوا ہے جو ضلالت سے ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اِس کے ایک معنی گمراہی کے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو اور ایک جگہ حیران کھڑا ہو کہ مختلف راستے جو سامنے ہیں اِن میں سے کدھر جاؤں۔ ایک اور معنی کھوئے ہوئے کے ہیں، چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں ضَلَّ الماءُ فی اللّبن، پانی دودھ میں گُم ہو گیا۔ اُس درخت کو بھی عربی میں ضالّہ کہتے ہیں جو صحراء میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔ ضائع ہونے کے لیے بھی ضلال کا لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو۔ غفلت کے لیے بھی ضلال کا لفظ استعمال ہوتا ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں اس کی مثال موجود ہے کہ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی (طٰہٰ۔ ۵۲) "میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے"۔ اِن مختلف معنوں میں سے پہلے معنی یہاں چسپاں نہیں ہوتے، کیونکہ بچپن سے قبلِ نبوت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات تاریخ میں موجود ہیں ان میں کہیں اِس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ آپ کبھی بُت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا ہوئے ہوں، یا جاہلیت کے جو اعمال، رسوم اور طور طریقے آپ کی قوم میں پائے جاتے تھے اُن میں سے کسی میں آپ ملوث ہوئے ہوں۔ اس لیے لامحالہ وَوَجَدَكَ ضَالًّا کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقیدے یا عمل کے لحاظ سے گمراہ پایا تھا۔ البتہ باقی معنی کسی نہ کسی طور پر یہاں مراد ہو سکتے ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایک اعتبار سے سب مراد ہوں۔ نبوت سے پہلے حضورؐ اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کے قائل تو ضرور تھے، اور آپ کی زندگی گناہوں سے پاک اور فضائلِ اخلاق سے آراستہ

لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو، [9] اور سائل کو نہ جھڑکو، [10] اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔ [11] ع

بھی تھی، لیکن آپ کو دینِ حق اور اس کے اصول اور احکام کا علم نہ تھا، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ، آیت ۵۲) "تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ ایمان کی تمہیں کوئی خبر تھی"۔ یہ معنی بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں کہ حضورؐ ایک جاہلی معاشرے میں گم ہو کر رہ گئے تھے اور ایک ہادی و رہبر ہونے کی حیثیت سے آپ کی شخصیت نبوت سے پہلے نمایاں نہیں ہو رہی تھی۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے صحرا میں آپ ایک اکیلے درخت کی حیثیت سے کھڑے تھے جس میں پھل لانے اور ایک پورا باغ کا باغ پیدا کر دینے کی صلاحیت تھی مگر نبوت سے پہلے یہ صلاحیت کام نہیں آ رہی تھی۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی قوتیں آپ کو عطا کی تھیں وہ جاہلیت کے ناسازگار ماحول میں ضائع ہو رہی تھیں۔ ضلال کو غفلت کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے، یعنی آپ اُن حقائق اور علوم سے غافل تھے جن سے نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ فرمایا۔ یہ بات خود قرآن میں بھی ایک جگہ ارشاد ہوئی ہے: وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف ۳) "اور اگرچہ تم اس سے پہلے اِن باتوں سے غافل تھے"۔

[8] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آپ کے والد ماجد نے میراث میں صرف ایک اونٹنی اور ایک لونڈی چھوڑی تھی۔ اس طرح آپ کی زندگی کی ابتدا افلاس کی حالت میں ہوئی تھی۔ پھر ایک وقت آیا کہ قریش کی سب سے زیادہ مالدار خاتون، حضرت خدیجہؓ نے پہلے تجارت میں آپ کو اپنے ساتھ شریک کیا، اس کے بعد انہوں نے آپ سے شادی کر لی اور ان کے تمام تجارتی کاروبار کو آپؐ نے سنبھال لیا۔ اس طرح آپ نہ صرف یہ کہ مالدار ہو گئے، بلکہ آپ کی مالداری اس نوعیت کی نہ تھی کہ محض بیوی کے مال پر آپ کا انحصار ہو۔ اُن کی تجارت کو فروغ دینے میں آپ کی اپنی محنت و قابلیت کا بڑا حصہ تھا۔

[9] یعنی تم چونکہ خود یتیم رہ چکے ہو، اور اللہ نے تم پر یہ فضل فرمایا کہ یتیمی کی حالت میں بہترین طریقے سے تمہاری دستگیری کی، اس لیے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ سے کبھی کسی یتیم پر ظلم اور زیادتی نہ ہونے پائے۔

[10] اِس کے دو معنی ہیں۔ اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجتمند کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی مدد کر سکتے ہو تو کر دو، نہ کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کر دو، مگر بہرحال اُسے جھڑکو نہیں۔ اِس معنی کے لحاظ سے یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اِس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم نادار تھے پھر اُس نے تمہیں مالدار کر دیا"۔ اور اگر سائل کو پوچھنے والے، یعنی دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والے کے معنی میں

معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص خواہ کیسا ہی جاہل اور اُجڈ ہو، اور بظاہر خواہ کتنے ہی نامعقول طریقے سے سوال کرے یا اپنے ذہن کی اُلجھن پیش کرے، بہر حال شفقت کے ساتھ اُسے جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اُسے جھڑک کر دُور نہ بھگا دو۔ اِس معنی کے لحاظ سے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اِس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم ناواقفِ راہ تھے پھر اُس نے تمہیں ہدایت بخشی"۔ حضرت ابوالدرداءؓ، حسن بصریؒ، سُفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے بزرگوں نے اِسی دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ ترتیبِ کلام کے لحاظ سے یہ ارشاد وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کے جواب میں آتا ہے۔

۱۱؎ نعمت کا لفظ عام ہے جس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سُورہ کے نزول کے وقت تک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ پاکؐ کو عطا فرمائی تھیں، اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں اُس نے اپنے اُن وعدوں کے مطابق آپ کو عطا کیں جو اِس سُورہ میں اُس نے کیے تھے اور جن کو اُس نے بدرجۂ اَتم پُورا کیا۔ پھر حکم یہ ہے کہ اے نبی ہر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے اُس کا ذکر اور اُس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ نعمتوں کے ذکر و اظہار کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کی ایک خاص صورت چاہتی ہے۔ مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اِس بات کا اقرار و اعتراف کیا جائے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں یہ سب اللہ کا فضل و احسان ہیں ورنہ کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمتِ نبوّت کا اظہار اِسی طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمتِ قرآن کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ لوگوں میں زیادہ سے زیادہ اُس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمتِ ہدایت کا اظہار اِسی طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اِس کام کی ساری تلخیوں اور ترشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ یتیمی میں دستگیری کا جو احسان اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ یتیموں کے ساتھ ویسے ہی احسان کا سلوک کیا جائے۔ نادار سے مالدار بنا دینے کا جو احسان اللہ نے کیا اس کا اظہار یہی صورت چاہتا ہے کہ اللہ کے محتاج بندوں کی مدد کی جائے۔ غرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات و احسانات بیان کرنے کے بعد اس مختصر سے فقرے میں اپنے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلّم

جناب نعیم صدیقی صاحب ڈائرکٹر ادارہ مطالعہ و تحقیق

(۳)

(۱۴) "العلم" کے علاوہ حضورؐ نے ہر قسم کے مفید علوم و فنون کے سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ نوشت و خواند کو پھیلانے کی سعی فرمائی۔[۵۷] صحتِ زبان کے اہتمام کی تلقین کی، فنِ کتابت کے لیے ہدایات دیں۔ صحابہ کو عبرانی زبان سیکھنے اور تورات کا علم حاصل کرنے پر متوجہ کیا۔ میدانِ بدر میں مجاہدین کی صف بندی کرا کے اور آغازِ جنگ کے لیے انہیں پابندِ فرمان بنا کر اور کوڈ ورڈز کی تعلیم دے کر دفاعی نظام کا بالکل نیا تجربہ شروع کیا۔[۵۸] نوجوانوں کو تعلیمِ جہاد دینے کے لیے دوڑ اور تیراندازی کے مقابلے کرائے، عین میدانِ جنگ سے قلعہ شکن آلات بنانے کی تربیت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کی ایک جماعت کو مقام جرش کی طرف بھیجا۔[۵۹]

خواتین کو اس دور کی ضروریات کے مطابق چرخہ کاتنے کی نصیحت کی۔ قریش کی عورتوں میں بچوں کی تربیت کا جو سلیقہ پایا جاتا تھا۔ اس کی تحسین کر کے اس صلاحیت کو بڑھانے کا راستہ نکالا نیز تربیت رفقا کو استیذان کے آداب سکھاتے، پراگندہ بالوں کو ترشوانے اور کنگھی کر کے سنوارنے کی تلقین کی، عیدین کے تہوار مسرت سے منانے کے لیے جائز حدود میں تفریح کا موقع پیدا کیا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر اعلانِ نکاح کے مسرت آمیز انداز سکھاتے اور لوگوں کو صحنوں کی صفائی کی نصیحت کی اور راستوں سے کانٹے اور کوڑا کرکٹ ہٹانے کی تربیت دی۔ نیز خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں میں میل جول

[۵۷] حدیث مشکوٰۃ۔ کتاب الآداب۔ روایت زید بن ثابت (ترمذی)

[۵۸] حدیث۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الجہاد

[۵۹] ملاحظہ ہو آیت: وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ (۸ - ۶۰)

کے آداب سکھائے

حضورؐ کا یہ وسیع تصورِ تعلیم قرآن کے جس کلمۂ حکمت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو آخرت کی بھلائی کے ساتھ دنیا میں بھی بھلائی حاصل کرنی ہے[60]

(۱۵) حضورؐ نے اپنی تعلیمی حکمت میں جسم کے حقوق کو پوری اہمیت دی۔ قرآن نے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت پر مامور کرتے ہوئے یہ معیارِ انتخاب پیش کیا ہے کہ ان کو علم اور جسم دونوں سے برتری حاصل ہے[61]، اسی معیار کے مطابق حضورؐ نے جسم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر فرمایا کہ فَاِنَّ لجسدک علیک حق[62]۔

اِس موقع پر حضورؐ کا یہ ارشاد قابلِ توجہ ہے کہ قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے[63]۔

—— جسم کی ضروریات مدِنظر رکھنے کا ثبوت وہ طبی تعلیم بھی ہے جو حضورؐ نے اس دور کے فنِ طب کے مطابق اپنے پیروؤں کو دی[64]۔

(۱۶) حضورؐ نے تعلیم کے فروغ کے لیے سوال کو یہ فرما کر بڑی اہمیت دی کہ علم ایک صندوق ہے جس کی کنجی سوال ہے یعنی سوالات اٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصب معلّمی کا لازمہ ہے۔

(۱۷) حضورؐ نے جدید دور کے فلسفیوں سے بہت پہلے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ تعلیم کا آغاز مہد سے ہونا چاہیے اور اس کا تسلسل لحد تک جاری رہنا چاہیے[65]۔

(۱۸) حضورؐ کی حکمتِ تعلیم کا ایک سبق یہ ہے کہ علم یہ دیکھ کر سیکھو کہ کس سے سیکھ رہے ہو یعنی آیا تمہارا معلّم و اُستاد بلحاظ قابلیت اور بلحاظ کردار قابلِ اعتماد ہے[66]؟

---

[60] ملاحظہ ہو آیت: ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار (۲-۲۰۱)

[61] ملاحظہ ہو آیت: و زادہٗ بسطة فی العلم والجسم (۲ - ۲۴۷)

[62] حدیث: ریاض الصالحین۔ باب فی الاقتصاد فی الطاعة۔ روایت عمرو بن العاص۔

[63] حدیث۔ ریاض الصالحین۔ باب فی المجاہدہ۔ روایت ابوہریرہؓ۔

[64] احادیث درباب طب۔ زاد المعاد از حافظ ابن القیم۔ ج ۳۔ ذکر الادویہ والاغذیہ۔ نیز ملاحظہ ہو: الاصابہ از ابن حجر و طبقات الاطباء عن ابن ابی اصیبعہ۔

[65] حدیث۔ اطلب العلم من المھد الی اللحد۔ منہاج المتعلم بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ از شبلی

[66] مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔

اس ارشاد کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کے لیے یہ لازم آتا ہے کہ وہ معلموں کے انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لے اور نہ صرف ان کی سندات اور علمی قابلیت کا جائزہ لے، بلکہ بلحاظ کردار ان کے خاندانی پس منظر اور تعلیمی دور کے ریکارڈ کو بھی زیر غور لائے جن لوگوں کو نئی نسل کے خیالات اور کردار کی تعمیر و تشکیل کا نازک ترین فریضہ سونپا جا رہا ہو ان کے متعلق دوسری ملازمتوں کے امیدواروں سے زیادہ سخت چھان بین ہونی چاہیے۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا معلمی کا کوئی امیدوار محض پیشہ ورانہ ذہنیت کے ساتھ آرہا ہے یا اس کے اندر صحیح مشنری جذبہ موجود ہے۔ بلکہ ملازمت میں آنے کے بعد بھی اساتذہ کے کردار کا ریکارڈ زیر نظر رکھنا چاہیے۔ اور جہاں کہیں کوئی آدمی اس کام کے لیے غیر موزوں نظر آئے اسے فوراً اس مقدس ذمہ داری سے الگ کر دیا جائے۔

(۱۹) حضورؐ نے ایسے علم سے بچنے کے لیے خدا کی پناہ طلب فرمائی جس سے لوگوں کو نفع نہ ہو[۶۷]۔ اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ کسی شخص کا علم حاصل کر کے اسے روک کے بیٹھ رہنا علم کی منفعت کو ضائع کرنا ہے، دوسرے یہ کہ بعض علوم و فنون ایسے ہو سکتے ہیں جو کوئی ٹھوس افادیت انسانوں کے لیے نہ رکھتے ہوں۔

(۲۰) حضورؐ نے علم اور دماغی قوتوں کے غلط استعمالات سے پرہیز کی تاکید کی ہے[۶۸]۔ مثلاً آپؐ نے جبر و قدر کے مسئلے پر ایک ایسی بحث کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا جس میں ایک فریق حقیقت کے ایک نصف حصے کو لیے ہوئے تھا اور دوسرا فریق دوسرے نصف حصے کو اور سچائی کے دونوں حصوں کو آپس میں ٹکرایا جا رہا تھا اسی سلسلے میں آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے سے نہ ٹکراؤ، واضح رہے کہ بحث و مناظرہ کی بیشتر صورتوں میں جو باعث تفرقہ و انتشار ہوتی ہیں یہی خرابی پائی جاتی ہے۔

پھر آپؐ نے ایسے سوالات پر بحث کرنے سے منع فرمایا جن کا نتیجہ سوائے گمراہی کے کچھ نہیں۔ مثلاً یہ سوال کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟[۶۹] اس طرح کے سوالات سے منع کیا گیا ہے کہ جس دائرۂ حقائق کے لیے ہمیں ذرائع علم دیتے ہی نہیں گئے۔ اس میں قدم رکھنے سے سوائے گمراہی کے کچھ حاصل نہیں۔

---

۶۷ حدیث مشکوٰۃ۔ باب الاستعاذہ۔ روایت زید ابن ارقم و ابوہریرہؓ۔

۶۸ حدیث مشکوٰۃ۔ باب الایمان والقدر۔ روایت ابوہریرہؓ۔

۶۹ حدیث مشکوٰۃ۔ باب الوسوسہ۔ روایت ابوہریرہؓ (ابوداؤد)،

(۲۱) ایک ہدایت حضورؐ نے یہ دی ہے کہ علم کے ذریعے مغالطہ نہ دیا جائے[۲۰] اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بیشتر اہلِ علم اور دانش ور اپنی ذہنی برتری کے ذریعے کم علم اور سادہ دل لوگوں کو مغالطے دیتے ہیں۔ آج بے شمار ایسے حکیمانہ اقوال اور دانشورانہ نکات کو علم و استدلال اور پروپگنڈے کے زور سے ناقابلِ تردید کلیات کا مقام دے دیا گیا ہے۔ جن کا تجزیہ کریں تو وہ ایک دلفریب مغالطہ ثابت ہوتے ہیں۔ پوری نوعِ انسانی کو آج کے علم نے چند بڑے بڑے مغالطوں کا شکار بنا دیا ہے۔

ایسے دائرہ ہائے امورِ غیب میں قدم رکھنے سے بھی روکا جن تک آدمی کے علم کی سرے سے دسترس ہی نہیں اور ایسے دوائر کے لیے اسے وسائلِ علم دیئے گئے ہیں[۲۱]

حضورؐ نے جحود بآیات اللہ، یعنی خدا کی آیات کی مخالفت کرنے کو شدید قسم کے نقصانِ علم کا موجب بنایا[۲۲] جس کے اثر سے سمع، بصر اور فواد کی قوتیں بھی صحیح طور پر کام نہیں کر سکتیں۔

(۲۲) بچوں کے متعلق حضورؐ کی حکمتِ تعلیم میں ایک خاص نقطۂ نظر دینی ہے جس کے چند نمایاں ارشادات یہ ہیں:

—— حضورؐ نے بچوں کی معصومیت کی تعبیر یہ کہہ کر فرمائی کہ یہ تو جنت کے باغوں کے پھول ہیں، یعنی ان سے محبت و ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہیے[۲۳]

—— پھر بچوں کے متعلق یہ فرمایا کہ وہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتے ہیں، بعد میں گھر اور معاشرے کا ماحول انہیں کسی دوسرے رنگ میں رنگ دیتا ہے[۲۴]

—— میرے نزدیک فطرۃ اسلام سے مراد وہی بات ہے جو قرآن میں تمام انسانوں کے لیے کہی گئی ہے[۲۵] اور اس کی تشریح ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ بتاتے ہیں کہ ہر فرزندِ آدم کے اندر ایک آواز فرشتے کی

---

۲۰ حدیث مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ روایتِ معاویہ۔

۲۱ ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (۱۷-۳۶)

۲۲ ملاحظہ ہوں آیات: وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ (۲۹-۴۹)، وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (۳۱-۳۲)

۲۳ حدیث: مشکوٰۃ۔ کتاب الوسوسہ۔ بحوالہ حضرت عائشہؓ۔ (مسلم)

۲۴ حدیث مشکوٰۃ۔ باب الایمان بالقدر، روایت ابوہریرہ (مسلم)

۲۵ ملاحظہ ہو آیت: فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰-۳۰)

ہوتی ہے اور ایک آواز شیطان کی۔ یعنی اس کے اندر خیر و شر کے دوگونہ رجحان پائے جاتے ہیں[۴۶] اور اسی کے ساتھ ساتھ اسے تمیز خیر و شر کا میلان بھی دیا گیا ہے۔ اس ارشاد کی رُو سے یہ گھر، مدرسے اور معاشرے کی تعلیمی سرگرمیوں پر منحصر ہے کہ وہ بچے کے اندر نیکی کی ملکوتی آواز کو زوردار بنا دیں، یا بدی کی شیطانی پکار کو غالب کر دیں۔

—— پھر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں حضورؐ نے والدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اپنی ساری اولاد سے مساوات کا معاملہ کریں۔ بصورتِ دیگر بچوں میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی اصول اجتماعی نظامِ تعلیم پر بھی لاگو ہوگا۔ درسگاہوں میں تمام طلباء کے ساتھ مساویانہ معاملہ ہونا چاہیے اور سب کے لیے حقوق و فرائض کی یکسانی کے ساتھ، اساتذہ کا رویہ ایک ہی جیسا ہونا چاہیے۔

—— حضورؐ کی حکمتِ تعلیم نے نظریۂ سزا بھی دیا جس کے دو نکات ہیں۔ ایک یہ کہ شدید ضرورت کے تحت سات سال کی عمر سے سزا دی جا سکتی ہے[۴۸]۔ دوسرے یہ کہ ایسی جسمانی سزا نہیں دی جانی چاہیے جو نشان چھوڑنے والی ہو۔ سخت قسم کے تھپڑ یا گھونسے یا بید یا قمچیاں نہیں لگانی چاہئیں۔ لازم نہیں کہ سزا جسمانی ہی ہو، اس کی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ جیسے کہ نُشُوز کی صورت[۴۹] میں عورتوں کو خواب گاہوں سے الگ کرنے کے قرآنی حکم کی مثال موجود ہے۔

نظریۂ سزا کے سلسلے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں:

ا۔ تعلیم کا بنیادی تقاضا محبت و شفقت ہے، سزا کی گنجائش محض غیر معمولی مواقع کے لیے استثنائی درجے میں رکھی گئی ہے۔

ب۔ اس نظریۂ سزا کے سامنے یہ حکیمانہ شعور بھی ہونا چاہیے کہ بگڑے ہوئے ماحول کے مقابلے میں اُس دورِ سعادت کا معاملہ الگ تھا جس کو پیشِ نظر رکھ کر حضورؐ نے نظریۂ سزا بیان فرمایا۔ سنوری ہوئی سوسائٹی میں ڈسپلن توڑنے اور سرکشی کرنے کی مثالیں شاذ ہوتی ہیں اور ان پر معمولی سی سزا دینی بھی اس لیے مؤثر ہوتی ہے کہ پورا ماحول سزا دینے والے ہاتھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ بگڑی ہوئی سوسائٹی میں جہاں بُرائی کی قوتیں حسین و دلکش اسالیب سے غلط روش کو مزیّن بنا کر سامنے لاتی ہوں اور ان کی وجہ سے فکری و اخلاقی محاذ پر ایک

---

[۴۶] حدیث: انّ للشیطان لمۃ بابن آدم وللملک لمۃ ... الخ۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان۔ روایت ابن مسعود

[۴۸] حدیث۔ مشکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ۔ روایت عمرو بن شعیب (ابوداؤد)۔ کتاب الایمان،

[۴۹] ملاحظہ ہو آیت: سورۂ نساء۔ آیت ۳۴۔

مستقل جنگ برپا ہو، دو ہی طرزِ عمل ہو سکتے ہیں یا تو سزا اصولِ عام بن جاتے، مشفقانہ رویّہ صرف نادر صورتوں میں سامنے آتے۔ یا پھر نیکی اور سچائی کے معلم اپنی شفقت کو اور زیادہ وسیع و عمیق بنا دیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت سزا کو غیر مؤثر بنا دے گی، لہٰذا دوسری صورت ہی مفید نتائج دے سکتی ہے۔

ج۔ سزا دہی کا معاملہ طبیب کی سی حکمتِ عملی کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں موقع اور محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔

د بعض اصحاب کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو ہٹا نہ دیا جائے۔[۴۹] یہاں تادیب کے عصا سے مراد سچ مچ کا عصا نہیں ہے بلکہ یہ ویسا ہی ہمارا استعاراتی اندازِ بیان ہے جیسے کہا جاتے کہ اپنے مخالفین کو بھی احسان کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو یا دشمن کو مارو تو بھلائی کی تلوار سے مارو۔ اگر کوئی شخص ان مواقع پر زنجیروں اور تلوار کے لفظ کے لغوی معنی لے لے تو وہ صریحاً غلطی کرے گا۔ یہاں استعاراتی مفہوم لیا جاتا ہے یعنی احسان کی زنجیروں اور بھلائی کی تلوار سے مراد احسان اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ ٹھیک اسی طرح تادیب کے عصا سے مراد محض تادیب ہی ہے۔ تادیب یا ادب سکھانا یا تربیت دینا ایک فنِ لطیف ہے۔

۲۳۔ حضورؐ کی تعلیم کا مرکزی نصاب قرآن تھا۔[۵۰] جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع گائیڈ بک ہے۔ تعلیم کے بقیہ شعبے اسی مرکزی نصاب کے اِرد گرد مرتب ہوتے ہیں۔

۲۴۔ سرکارِ رسالت مآب کی حکمتِ تعلیم کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح معلم کو متعلمین کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس طرح متعلمین کے لیے لازم ہے کہ وہ معلم کا ادب و احترام رکھیں۔[۵۱] اس ہدایت میں یہ تقاضا از خود مضمر ہے کہ معلم بلحاظِ قابلیت اور بلحاظ کردار اور بلحاظ معلمانہ روش کے ایسے اوصاف سے متصف ہو کہ طلبا میں اس کے لیے احترام نشو و نما پائے۔

توسیعِ تعلیم کے لیے حضورؐ کی مساعی

اب اجمالاً ان مساعی پر نگاہ ڈالیے جو حضورؐ نے توسیعِ تعلیم کے لیے سر انجام دیں

[۴۹] حدیث: ولا ترفع عنهم عصاك ادباً۔ مشکوٰۃ۔ باب الکبائر و علامات النفاق۔ روایت حضرت معاذؓ۔

[۵۰] متعدد احادیث: مشکوٰۃ۔ کتاب فضائل القرآن

[۵۱] حدیث: تواضعوا لمن تتعلمون منه (الجامع الصغیر الکامل لابن عدی منہاج المتعلم)

ایک طرف تو نظامِ صلوٰۃ، اس میں تلاوتِ قرآن اور خطباتِ جمعہ کا نظام بجائے خود فروغِ تعلیم کا ذریعہ تھا، دوسری طرف حضورؐ خاص مواقع پر زائد خطبات بھی دیتے اور تعلیمی مجالس بھی منعقد فرماتے۔

توسیعِ تعلیم کے لیے آپ کا یہ ارشاد بڑا اہم ہے کہ اچھے لوگ وہ ہیں جو معلّم ہوں یا متعلّم[۵۲]۔ پھر آپؐ نے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا کے قرآنی حکم کے تحت والدین پر ذمہ داری ڈالی کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دیں[۵۳]۔ پڑوسیوں کو پڑوسیوں سے علم حاصل کرنے کی تلقین کی۔

لکھنے کا ہنر عام کرنے کے لیے بدر کے قیدیوں کے لیے یہ فدیہ بھی مقرر کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا سکھا دیں[۵۴]۔

حضورؐ نے دورِ مکہ میں دارِ ارقم کو جس طرح عبادات اور مشاورت کا مرکز بنایا، اسی طرح وہ تعلیم کا پہلا مرکز بھی تھا[۵۵]۔

مدنی دور میں دوسرا وسیع تر اور باقاعدہ قسم کا مدرسہ صُفّہ کے نام سے مسجد نبوی میں قائم ہوا جس میں زیادہ تر باہر سے آنے والے نومسلم اور کچھ مقامی لوگ مقیم رہ کر تعلیم حاصل کرتے۔ اسے ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر احمد شبلی نے اقامتی درسگاہ قرار دیا ہے[۵۶]۔ اس درسگاہ میں نہ صرف قرآن کی سورتیں یاد کرائی جاتیں اور فنِ تجوید کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کا فن اور فقہ کا علم بھی سکھایا جاتا تھا[۵۷]۔ مُسندِ امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق درسگاہ صفہ کے طلبہ کی تعداد ایک موقع پر ستّر تک پہنچی[۵۸]۔

حضرت عبادہ بن صامت کا بیان ہے کہ خود انہوں نے چند اصحابِ صُفّہ کو قرآن اور کتابت کی تعلیم دی[۵۹]۔

---

۵۲ حدیث: سُننِ دارمی۔ المقدمہ۔ باب ۲۵-۳۱۔

۵۳ ملاحظہ ہو سورۂ تحریم: آیت ۶۔

۵۴ مُسند امام احمد بن حنبل۔ ج ۱، ص ۲۴۶۔ نیز الکامل للمبرد۔ ج ۱، ص ۱۷۱۔

۵۵ تاریخ الامم والملوک (طبری)، بحوالہ ڈاکٹر احمد شبلی۔

۵۶ حدیث: سُننِ ابن ماجہ۔ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم۔

۵۷ مُسند امام احمد بن حنبل۔ ج ۳، ص ۲۷۱۔

۵۸ ایضاً

۵۹ حدیث: ابوداؤد۔ کتاب البیوع فی کسب المعلم۔

اس درسگاہ کے ایک درخشندہ طالب علم حضرت ابوہریرہ تھے۔[۹۰]

حضورؐ کے توسیعِ تعلیم کے منصوبے کا ایک اہم جزو یہ تھا کہ ہر مسجد مرکزِ تعلیم بھی تھی۔ خود آنحضورؐ کے دور میں مدینہ میں نو مسجدیں[۹۱] ایسی تھیں جہاں بڑوں اور بچوں کو دین اور قرآن اور معاملات زندگی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

توسیعِ تعلیم کے لیے حضورؐ مختلف قبائل کی طرف قُرّاء کو بھجواتے۔ واضح رہے کہ درسگاہِ صُفّہ کے فارغ التحصیل قرّاء کہلاتے تھے۔[۹۲] قرّاء قاری کی جمع ہے، مگر یہ لوگ آج کل کے معنوں میں قاری نہ ہوتے تھے بلکہ تلاوتِ قرآن کے ساتھ ساتھ فہمِ قرآن اور تفقہ فی الدین میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ یہ قرّاء فوجی دستوں کے ساتھ بھی علاقوں میں بھجوائے جاتے تاکہ وہ خود مجاہدین کی تعلیم کا سلسلہ سفر میں بھی جاری رکھیں اور اگر کوئی قبیلہ اطاعت قبول کرے تو اس کے لوگوں کو تعلیم دیں۔[۹۳]

درسگاہِ صفّہ کے ذریعے ان قرّاء کی تعداد اس تیزی سے بڑھی کہ ایک مرتبہ ستر قاریوں کا قافلہ علاقہ نجد کے قبائل کی تعلیم کے لیے روانہ کیا گیا۔ ان قیمتی ہستیوں کو بئر معونہ کے مقام پر ان فریب کار بدویوں نے شہید کر دیا جنہوں نے خود ہی درخواست کر کے ان کو بلوایا تھا۔[۹۴]

جن ممتاز صاحبِ علم شخصیتوں کو حضورؐ کسی مقام پر اپنا عامل یا نمائندہ بنا کر بھیجتے ان کے ذمے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دینے کا کام بھی کرتے۔ چنانچہ بنی حارث کی طرف خالد بن ولید کو بھیجا گیا تو ان کو تعلیم کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔[۹۵] اسی طرح عمرو بن حزم عاملِ یمن کو حضورؐ نے تحریری ہدایات دیں کہ وہ لوگوں کو قرآن سکھائیں، اس میں تدبر و تفکر کی تربیت دیں اور انہیں آگاہ کریں کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور ان پر فرض کیا عائد ہوتے ہیں۔[۹۶]

---

[۹۰] مسلم۔ کتاب الفضائل۔ باب فضائل ابی ہریرہؓ۔ (بحوالہ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی)

[۹۱] عینی شرح بخاری، ج ۲۔ ص ۴۶۸۔ (بحوالہ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی)۔

[۹۲] حدیث: مسلم۔ کتاب الامارہ۔ ثبوت الجنۃ للشہید۔

[۹۳] حدیث: بخاری، ج ۲۔ ص ۵۸۵۔

[۹۴] حدیث: مسلم۔ کتاب الامارہ۔ باب ثبوت الجنۃ للشہید۔

[۹۵] الوثائق السیاسیہ۔ مکتوب ۷۹۔ [۹۶] ایضاً

سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۲ کے مطابق مختلف نومسلم قبائل کے وفود مدینہ میں آکر قیام کرتے اور حضورؐ اور صحابہ سے علم حاصل کرکے واپس جاتے اور اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے[۹۷] اس قسم کا ایک وفد مالک بن الحویرث کی سرکردگی میں مدینے آکر ۲۰ روز تک مقیم رہا[۹۸]

بعض خاص مواقع پر حضورؐ نے خصوصی معلمین کا تقرر فرمایا۔

مثلاً سب سے پہلی مثال ہجرت سے قبل کی ہے جبکہ آپؐ نے اہلِ مدینہ کے لیے سعد بن العاص کا تقرر بطور معلم فرمایا اور انہیں مامور کیا کہ وہ دین سکھانے کے علاوہ لوگوں کو لکھنے کی تعلیم دیں۔ واضح رہے کہ حضرت سعد خوش نویس تھے[۹۹] ان کے متعلق المجبر کی روایت یہ ہے کہ انہیں معلم حکمت کا لقب دیا گیا[۱۰۰]

اسی طرح فتح مکہ کے بعد[۱۰۱] حضرت معاذ کو مکہ کے نومسلموں کی تعلیم کے لیے مامور کیا گیا۔

ان مساعی کے واضح نتائج تاریخ ہمارے سامنے رکھتی ہے۔

وہ قومِ قریش جس کے ہاں اسلام سے پہلے جملہ ۱۷ آدمی نوشت وخواند جانتے تھے ان کے نبی کے گرد مدینہ میں کاتبانِ وحی اور محررانِ مکاتیب کا ایک وسیع سیکرٹری ایٹ موجود تھا۔

مردوں کا معاملہ الگ رہا، ۵ خواتین بھی لکھنا پڑھنا سیکھ گئی تھیں اور وہ یہ تھیں (۱) حضرت حفصہ بنت عمرؓ (۲) حضرت ام کلثوم بنت عقبہ (۳) حضرت عائشہ بنت سعد (۴) حضرت کریمہ بنت مقداد۔ اور (۵) حضرت الشفا بنت عبداللہ عدویہ جو حضرت حفصہ کی استاد تھیں۔ قرونِ اولیٰ میں ۳۴۵ خواتین محدث تھیں[۱۰۳]

آہستہ آہستہ اہلِ تخصص (SPECIALISTS) پیدا ہوئے۔ جیسے کہ حضورؐ نے علم فرائض میں زید بن ثابت کو، قرآن خوانی اور تجوید میں ابی بن کعب کو، حرام وحلال کے احکام کا علم رکھنے میں حضرت معاذ بن جبل کو

---

۹۷ تفسیر خازن۔ تفسیر ماکان للمومنین لینفروا کافۃ (بحوالہ تاریخ اسلام، مولانا معین الدین ندوی)

۹۸ حدیث بخاری۔ باب رحمۃ البہائم (بحوالہ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی)

۹۹ المجبر ورق ۱۵۹ (ابوداؤد)

۱۰۰ ایضاً

۱۰۱ حدیث: بخاری۔ ج ۱۔ ص ۷۴

۱۰۲ فتوح البلدان، بلاذری ص ۴۵۸۔

۱۰۳ ابن حجر۔ الاصابہ۔ فی تمیز الصحابہ

مرتبۂ اوّل پر شمار کیا۔[44] اسی طرح ایک موقع پر فرمایا کہ چار آدمیوں سے قرآن سیکھو: عبداللہ بن مسعود سے، سالم مولیٰ ابو حذیفہ سے، ابی بن کعب سے اور معاذ بن جبل سے۔[45]

کتنا حیرت ناک واقعہ ہے کہ یہ تیز رفتار تعلیمی سرگرمی ایسے حالات میں رُو بعمل آئی جبکہ مسلسل ایمرجنسی کا دور تھا اور مدینہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست کثیر التعداد دشمنوں کے حملہ ہائے مسلسل کی زد میں تھی۔ بات یہ ہے اصل چیز تو یہ تعلیمِ دین ہی تھی جس کے بل پر ریاست کھڑی تھی اور جس کی دی ہوئی سپرٹ مسلمانوں کو معرکہ ہائے کارزار میں اپنے سے بڑی طاقتوں پر فتح دلا رہی تھی۔ اس تعلیم کے کام میں اگر کوتاہی رہ جاتی تو پھر اور کچھ بھی نہ ہوتا۔

دوسرا اثر/نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ العلم کے ساتھ ساتھ مختلف دنیوی علوم و فنون میں بھی مسلمانوں میں نہایت تیزی سے ترقی ہوئی اور ہیئت، نجوم، جغرافیہ، طب، جراحت، فلسفہ، سائنس، ریاضی، الجبرا، کتابت، نقاشی، تزئین، تعمیر، جنگی فنون، جہاز رانی، آہن گری، صیقل گری وغیرہ میں صدی دو صدی کے اندر مسلمانوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ ان کی علمی قوت نے یورپ کو مرعوب کر کے اپنے دائرۂ اثر میں لے لیا۔

تیسرا سبق آموز نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی شروع کی تعلیمی مہم نے مسلمانوں میں ایسا فکری، تہذیبی استحکام پیدا کر دیا کہ انہوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کے باطل اور فاسد علوم سیکھے مگر وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے العلم کی کسوٹی پر پرکھا، پھر جو کچھ اس کے مطابق پایا اُسے قبول کیا اور جو کچھ اس کے خلاف پایا اسے یا تو تشکیلِ نو کے عمل سے گزارا یا مسترد کر دیا۔ آج جبکہ علمی پسماندگی کے ساتھ ساتھ داخلی طور پر فکری و تہذیبی استحکام موجود نہیں ہے اور بحیثیت ملتِ اسلامیہ کے ہماری اجتماعی خودی کمزور ہو گئی ہے۔ ہم غالب اقوام کے نظریات اور علوم کے سامنے نہایت اطمینان سے شکست کھا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

کلمۂ آخر

آیئے، اس گفتگو کو ختم ہوتے ہم اپنے مقام کو دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایک غیر قوم نے باہر

---

[44] ترمذی۔ مناقب عشرہ مبشرہ۔ روایت انس۔

[45] بخاری و مسلم۔ باب جامع المناقب۔ و علم التواریخ، فن روایت و درایت۔

سے آکر ہمیں اپنی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک نظامِ تعلیم ہم پر مُسلط کیا جو ملّتِ اسلامیہ کے مزاج کے خلاف تھا۔ نبی اکرمؐ کی حکمتِ علم اور حکمتِ تعلیم کے خلاف تھا اور جس نے آہستہ آہستہ اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا۔ اس نظامِ تعلیم کے تیزاب میں ہماری خودی اس طرح تحلیل ہو گئی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد سالہا سال گزر جانے کے باوجود ہم اس تعلیمی قفس سے نجات نہیں پا سکتے۔

بد قسمتی سے نظریۂ پاکستان اور اسلام کے دلکش الفاظ کو سیاسی کھلونوں کی طرح استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جب کبھی ایسا ہوا کہ قمار خانۂ مفاد میں ہر دوسری تدبیر پٹ گئی تو مقامروں نے فوراً نعرۂ اسلام کو اٹھا کر بساط پر رکھ لیا۔ پھر جب وقتی بازی مکمل ہو گئی تو اس نعرہ کو کسی آئندہ امرِ جنبی کے لیے محفوظ رکھ دیا گیا۔

کارپردازانِ تعلیم کے حلقوں میں زیادہ سے زیادہ اب تک جو کچھ سوچا گیا ہے وہ بس اتنا ہے کہ اس مسلط شدہ نظامِ تعلیم کے نصابیات میں چند اچھی باتیں اسلام کی بھی داخل کر دی جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی ٹمٹینک میں چند پرزے شکر سازی کی مشین کے فٹ کر کے یہ سمجھیں کہ اب یہ ٹینک شکر بنانے لگے گا۔

ایک خاص تہذیبی نظام کی علمبردار ملّت اور تحریکِ فلاحِ انسانیت کی مشعل بردار قوم اپنی ضرورت کا پُورا نظامِ تعلیم خود بناتی ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریات کی بنیاد اپنے ایمان و معتقدات پر رکھتی ہے وہ نصابیات کے ہر جزو میں اپنے اجتماعی نصب العین کی روح داخل کرتی ہے وہ اپنی حکمتِ تعلیم پر علوم کی بنیادیں رکھتی ہے۔ اور اس کی تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہوتا ہے جیسے انسان مخصوص نظامِ حیات کو چلانے اور اس کی بین الانسانی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مطلوب ہوتے ہیں۔

مَیں ملک کے ذی شعور معلّمین اور ماہرینِ تعلیم کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ نبی اکرمؐ کے تعلیمی کارنامے کی روشنی میں ملّتِ پاکستان کے لیے ایک صحت مند نظامِ تعلیم کا نقشہ مرتب کریں اور اسے موجودہ خلافِ ایمان اور خلافِ مزاج نظامِ تعلیم سے نجات دلائیں جس نے ہماری نسلوں کو فکری اور اخلاقی لحاظ سے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

اسلام میں حلال و حرام کا تصوّر

از
شیخ یوسف القرضاوی
ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

حلال، وہ جائز امر ہے جس سے خطرے اور اندیشے کا کوئی امکان نہ ہو اور جس کے کرنے کی شارع نے اجازت دی ہو۔

حرام، وہ امر جس کے کرنے سے شارع نے اتنی سختی سے منع کر دیا ہو کہ شارع کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کے لیے آخرت میں عذابِ الٰہی سے دوچار ہونا پڑے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اُسے دنیا میں بھی شرعی سزا سے سابقہ پیش آجائے۔

مکروہ، جب شارع نے کسی چیز سے منع تو کیا ہو مگر اُس کے منع کرنے میں کوئی شدت روا نہ رکھی ہو تو اُس چیز کو مکروہ کہتے ہیں۔ یہ درجے میں حرام سے کم ہے۔ اور اس کے مرتکب کے لیے حرام کے مرتکب جیسی سزا نہیں۔ مگر اگر کوئی مکروہات کے ارتکاب پر اصرار کرے اور اکثر و بیشتر اس سے مکروہ افعال سرزد ہوتے رہیں تو مکروہات کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے مرتکب کو حرام کے ارتکاب پر دلیر کر دیتے ہیں۔

حلال و حرام میں اسلام کے اصول و مبادی | حلال و حرام کا معاملہ بھی منجملہ اُن امور کے ہے جن میں اہلِ جاہلیت نے کافی حد تک گمراہی و کجروی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اتنے پریشانی اور اُلجھن میں پڑے کہ حرام اور ناپاک کو حلال کر دیا اور حلال اور پاکیزہ کو حرام قرار دیا۔ اس میں بُت پرست اور اہلِ کتاب سب برابر ہیں۔ یہ گمراہی جس طرح انحراف اور حدِ اعتدال سے تجاوز کی صورت میں دائیں طرف اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اسی طرح بائیں طرف بھی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

دائیں طرف ہم سنگدلانہ ہندو برہمنیت اور بے لگام مسیحی رہبانیت وغیرہ ایسے مذاہب کو دیکھتے

ہیں جن کی بنیاد سزائے جسمانی، رزقِ حلال کو اپنے اُوپر حرام کر لینے اور اللہ نے جو زیب و زینت اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اس سے اجتناب و انحراف پر ہے۔ اور قرونِ وسطیٰ میں مسیحی رہبانیت بے اعتدالی کے اوج پر پہنچ گئی تھی۔ اور ہزاروں راہبوں نے پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دینے میں نہایت سخت رویہ اختیار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ اُن میں سے بعض نے پاؤں کو دھونے کو گناہ کہا اور حمام میں داخل ہونے کو باعثِ حُزن و حسرت قرار دے دیا تھا۔

بائیں طرف ہم مذہبِ مزدک کو دیکھتے ہیں جس کا ظہور سرزمینِ فارس میں ہُوا۔ یہ مذہب مطلق اباحیت کا قائل ہے اور اپنے پیروکاروں کو بالکل بے لگام چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ہر چیز پر قبضہ کر سکتے ہیں اور اُسے اپنے لیے مُباح سمجھ سکتے ہیں حتیٰ کہ لوگوں کی عزت و آبرو اور ہر وہ چیز جسے لوگ فطری طور پر مقدس اور قابلِ حفاظت سمجھتے ہیں، اس مذہب کے پیروکاروں کے نزدیک جائز و مباح ہے۔

اشیاء و اعمال کے حرام و حلال کے معیار و مقیاس میں بدنظمی کی ایک واضح مثال دَورِ جاہلیت کی قومِ عرب ہے۔ انہوں نے شراب خوری، سُود در سُود خوری، عورتوں کی ایذا رسانی اور اُن کو نکاح سے روکنے وغیرہ کو مباح و جائز سمجھ رکھا تھا۔ مزید برآں شیاطینِ جن و انس نے اُن میں سے بیشتر کے لیے اپنی اولاد اور جگر گوشوں کو قتل کر دینے کے عمل کو خوب مزین کر کے پیش کیا۔ چنانچہ انہوں نے اُن کی اطاعت کی اور اپنے سینوں میں موجزن سارے پدری جذبات کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ (انعام: ۱۳۷)	اور ایسے ہی زینت دی بہت سے مشرکین کے لیے قتل کرنے کو اپنی اولاد کے اُن کے شریکوں نے تاکہ وہ انہیں ہلاک کر دیں اور کہ خلط ملط کر دیں ان پر اُن کے دین کو۔

ان شرکاء نے جو خادمانِ اصنام کہلاتے تھے، والدین کے لیے اپنی اولاد کے قتل کو زینت دینے کے بہت سے طریقے اختیار کیے۔ کسی کو تنگ دستی و غربت کا خوف دلایا۔ کسی کے ہاں اگر لڑکی پیدا ہو گئی تو اُسے خوفِ رسوائی اور شماتتِ اعداء سے دوچار ہونے کا خیال دلا دیا۔ کسی سے کہا کہ اگر تم دیوتاؤں کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی اولاد کو اُن کی بھینٹ چڑھاؤ۔

تعجب ہے کہ جن لوگوں نے اولاد کو ذبح اور زندہ درگور کرنے کو مباح ٹھہرایا، انہوں نے خود اپنے

اُوپر بہت سی پاکیزہ چیزوں کو حرام کر لیا اور اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس فعل کو احکامِ دین کا ایک حصہ قرار دے کر اس کی نسبت خدائے بزرگ و برتر سے کر دی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس جھوٹی نسبت کو رد کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وقالوا هٰذه انعام وحرث حجر لا يطعمها الا من نشاء بزعمهم وانعام حرمت ظهورها وانعام لا يذكرون اسم الله عليها افتراء عليه سيجزيهم بما كانوا يفترون۔ (الانعام: ۱۳۸)

وہ کہتے ہیں یہ جانور اور کھیت محفوظ ہیں۔ انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں حالانکہ یہ پابندی اُن کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افتراء کیا ہے۔ عنقریب اللہ انہیں ان افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔

قرآن مجید میں اُن لوگوں کی گمراہی و ضلالت کو یُوں واضح طور پر بیان فرمایا گیا ہے جنہوں نے حرام چیزوں کو حلال اور حلال چیزوں کو حرام قرار دیا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔ (الانعام: ۱۴۰)

یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھیرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہِ راست پانے والوں میں سے نہ تھے۔

جب اسلام ظہور پذیر ہوُا تو اُس وقت حلال و حرام کے معاملے میں یہ ضلالت و گمراہی موجود تھی۔ اس نے زندگی کے اس اہم پہلو کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ قانون سازی کے جملہ بنیادی اصول وضع کیے جن کی روشنی میں حرام و حلال کے اصول و مبادی متعین کیے گئے۔ چنانچہ معاملات میں دُشواری پیدا ہو گئی۔ عدل و انصاف اور حرام و حلال کے معاملے میں توازن قائم ہو گیا۔ یُوں مسلمان گمراہیوں اور بدراہیوں کے درمیان "اُمتِ وسط" بن گئے۔ اللہ تعالیٰ جس نے مسلمان قوم کو اُمتِ وسط بنایا ہے، اس اُمت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ یہ اُمت وہ بہترین اُمت ہے جسے لوگوں کی ہدایت و

تبلیغ حق، کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

اشیاء کی حلت و حرمت کی بنیاد اباحت ہے[1] حلال و حرام کے بارے میں اسلام نے سب سے پہلے جو اُصول اور قاعدہ مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اشیاء اور منافع پیدا کیے ہیں اُن کی حلت و حُرمت کی بنیاد اباحت ہے۔ کسی چیز کو اُس وقت تک حرام نہیں کہا جا سکتا جب تک شارع کی طرف اس کے حرام ہونے کے متعلق کوئی نصِ صریح وارد نہ ہو۔ اگر کوئی نصِ صحیح نہ ہو جیسا کہ ضعیف احادیث ہوتی ہیں یا وُہ کسی چیز کے حرام ہونے کے بارے میں صراحت نہ کرتی ہو تو وہ شریعت کی رُو سے مُباح اور حلال ہو گی۔

اشیاء و منافع کی بُنیاد اباحت ہے، اس کے لیے علمائے اسلام نے قرآنِ مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (بقرہ - ۲۹)	وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔
وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (جاثیہ: ۱۳)	اس نے زمین و آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ سب کچھ اپنے پاس سے۔
اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔ (لقمان: ۲۰)	کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ وہ ان چیزوں کو پیدا کرے اور انہیں انسان کے لیے مسخر کر کے اُس پر احسان کرے پھر انہیں حرام کر کے انسان کو اُن کے فوائد و منافع سے محروم کر دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُن چیزوں کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے اور اُسی کے لیے ان کو مُسخّر کیا ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا انعام بھی اُسی پر کیا ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُس نے ان چیزوں کے بعض جزئیات کو کسی سبب اور حکمت کی بنا پر جو انسان پر حرام کر دیا ہے۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

حدیث میں وارد ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال فرمایا ہے وہ حلال ہے اور جسے حرام فرمایا ہے وہ حرام ہے اور جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے وہ عفوِ الٰہی ہے لہٰذا تم اللہ کی

[1] شریعت کا کسی چیز کو جائز قرار دینا۔

طرف سے چھوٹ کو قبول کرو۔ کیونکہ اللہ ایسا نہیں کہ کچھ بھول جائے، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی
وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (سورۃ مریم)[1]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھی، پنیر اور پوستین کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال فرمایا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام فرمایا ہے۔ اور جس کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا وہ اللہ کی چھوٹ ہے"[2]۔ آپؐ نے سوال کرنے والوں کو ان جزئیات کے بارے میں کوئی جواب نہ دینا چاہا بلکہ انہیں ایک ایسے قاعدے کی نشاندہی کر دی جس کی طرف وہ حلال و حرام معلوم کرنے کے لیے رجوع کر سکیں۔ ان کو اتنا ہی جان لینا کافی تھا کہ اللہ رب العزت نے کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ ان کے علاوہ باقی سب چیزیں حلال اور پاکیزہ ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ کچھ فرائض ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزیں حرام کی ہیں انہیں حلال نہ کرو اور کچھ چیزوں کے بارے میں جان بوجھ کر محض اپنی رحمت کے تقاضے سے خاموشی اختیار کی ہے۔ تم انہیں نہ کریدو"[3]۔

میں یہاں اس بات سے خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اباحت صرف اشیاء و اشخاص تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ افعال و اعمال بھی اس میں شامل ہیں جو امورِ عبادت سے نہیں اور جنہیں معمولاتِ حیات یا معاملاتِ زندگی سے موسوم کرتے ہیں۔ ان افعال و اعمال میں سے سوائے ان کے جنہیں شارع نے حرام فرما کر ان کے ترک کر دینے کا حکم دیا ہو کسی فعل و عمل پر کوئی پابندی نہیں اور نہ اُسے حرام کہا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (اللہ نے جو چیزیں تم پر حرام کی ہیں وہ الگ الگ کر کے بیان کر دی ہیں)، سب اشیاء و افعال کے بارے میں ہے۔

یہ اُن عبادات سے مختلف ہیں جو احکامِ دین میں سے ہیں اور جن کا منبع صرف وحی الٰہی ہے۔ انہی امورِ عبادت کے متعلق صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جس نے ہمارے امور (امورِ عبادت) میں کسی نئی چیز کو شامل کیا اس کا یہ عمل ناقابلِ قبول ہو گا[4]۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کی حقیقت مندرجہ ذیل دو امور میں منحصر ہے۔

---

[1] مستدرک حاکم۔ [2] ترمذی اور ابنِ ماجہ [3] دار قطنی [4] متفق علیہ

۱۔ صرف اللہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت کی جائے۔

۲۔ اور عبادت کا جو طریقہ اُس نے بتایا ہو اس کے مطابق اس کی عبادت کی جائے۔

لہٰذا اگر کوئی بھی شخص عبادت کا کوئی طریقہ اپنی طرف سے ایجاد کرے تو وہ ضلالت و گمراہی کی جوتی کے سر پہ ماردی جائے گی کیونکہ صرف شارع ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عبادت کے وہ طریقے متعین کرے جنہیں اختیار کرکے اُس کا قُرب حاصل کیا جاسکتا ہو۔

جہاں تک معمولاتِ حیات یا معاملاتِ زندگی کا تعلق ہے تو اُن میں شارع نے کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کرنے کو نہیں کہا بلکہ لوگ خود اپنے معاملاتِ زندگی میں کوئی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں اور شارع ان کے طرزِ عمل کو شائستہ بناکر صحیح رستے پر ڈال دیتا ہے۔ اور بعض اوقات کسی خاص طرزِ عمل کا تعین بھی کردیتا ہے اگر فتنہ و فساد اور نقصان کا احتمال نہ ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: "اقوال و افعال میں بندگانِ خدا جو طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں اس کی دو قسمیں ہیں: ایک عبادات جن سے اُن کا دین سنورتا ہے۔ دوسرے وہ عادات و معمولات جو انہیں دنیاوی امور میں اپنانے پڑتے ہیں۔ اگر شریعت کے اصولوں کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عبادات جو اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں یا جنہیں اس نے پسند فرمایا ہے اُن کا حکم صرف شریعت ہی میں ثابت و وارد ہے اور عادات و معمولات وہ اعمال و افعال ہیں جنہیں لوگ اپنی دنیاوی ضروریات کے تحت اپنا لیتے ہیں۔ ان کے حرام و حلال ہونے کے بارے میں بنیادی حیثیت اس بات کو حاصل ہوگی کہ اگر خداوند تعالیٰ نے کسی خاص فعل یا طرزِ عمل سے منع کیا ہو تو وہ حرام ہے ورنہ حلال اور مباح۔ اور عبادات کے متعلق لازمی طور پر اللہ وحدہٗ لا شریک کا حکم ہوگا۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ فلاں فلاں کام سے اللہ نے رُکنے کا حکم دیا ہے اس کے بارے میں کیسے یہ فیصلہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ منع ہے۔

اسی بنا پر امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر فقہائے اہلِ حدیث کہتے ہیں، عبادات کی اصل بنیاد "توقیف" پر ہے صرف وہی عبادات اور طریقہائے عبادت شریعت کا حصہ قرار پائیں گے جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے شریعت کہا ہو ورنہ ہم مندرجہ ذیل فرمانِ الٰہی کی زد میں آجائیں گے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ۔ (شوریٰ: ۲۱)

کیا اُن کے لیے اور شریک ہیں جنہوں نے مقرر کیا اُن کے لیے وہ دین جس کا نہیں حکم دیا اللہ نے۔

عادات و معمولاتِ زندگی کے حرام و حلال میں بنیادی حیثیت عفوِ الٰہی کو حاصل ہوگی۔ صرف وہی افعال و اشیاء منع ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام فرما دیا ہو ورنہ ہم اس فرمانِ خداوندی کی زد میں آجائیں گے۔

قُلْ اَرَاَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ کہہ دیجیے دیکھو تو جو نازل کیا اللہ نے تمہارے لیے رزق

فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا (یونس: ۵۹) تم نے بنا دیا اس میں سے کچھ حرام اور کچھ حلال۔

یہ ایک مفید و عظیم قاعدہ ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہم کہتے ہیں:

بیع و شریٰ، ہبہ اور اجارہ وغیرہ زندگی کے وہ معمولات ہیں جن کی لوگوں کو اپنے معاش یعنی خورد و نوش اور لباس میں ضرورت ہوتی ہے۔ شریعت ان معمولات کو مختلف آداب کا پابند بناتی ہے اور ان میں سے جو باعثِ فتنہ و فساد ہو اسے حرام کر دیتی ہے اور کچھ لازمی امور فرض کرتی ہے اور بعض باتوں کو مکروہ قرار دیتی ہے اور ان معمولات کی قسموں اور ان کی مقادیر میں جو ترجیحی طور پر مفید ہوں انہیں مستحب ٹھہراتی ہے۔ چنانچہ لوگ جس طرح چاہتے ہیں ایک دوسرے سے بیع و شرا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو مزدوری پر رکھتے رکھواتے ہیں جب تک کہ شریعت انہیں حرام نہیں کر دیتی۔ اسی طرح جب شریعت کسی چیز کو حرام نہ کر دے لوگ اپنے حسبِ منشا کھاتے پیتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض چیزیں مستحب یا مکروہ ہو سکتی ہیں۔ اور جب تک اس سلسلے میں شریعت کوئی حد مقرر نہ کر دے لوگ اُسی عمومی قاعدے پر عمل کرتے رہیں گے[1]

مختلف اشیاء و اعمال کی اباحت کے متعلق مذکورہ بنیادی قاعدے کی طرف وہ صحیح حدیث بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم عزل کرتے تھے درآنحالیکہ قرآن نازل ہو رہا تھا، اگر یہ کوئی ایسا فعل ہوتا جس سے منع کر دیا گیا ہے تو قرآن مجید میں ضرور اس کے منع کا حکم آتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جن امور و افعال کے بارے میں وحی الٰہی خاموش ہے وہ بالکل منع نہیں اور وہ حلال ہی رہتے ہیں جب تک کہ اُن سے روکنے اور منع کرنے کے بارے میں کوئی قطعی اور صریح نص وارد

(باقی صفحہ ۲۹۴ پر)

---

[1] ماخوذ از القواعد النورانیہ الفقہیہ تالیف ابن تیمیہ ص ۱۱۲، ۱۱۳۔ اسی قاعدے کی بنیاد پر ابن تیمیہ، ان کے شاگرد رشید ابن قیم اور حنبلی فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ عقود (معاہدے)، و مشروط (باہمی رضامندی کے معاملات) میں کوئی پابندی نہیں جب تک کہ کسی معاہدے کے حرام ہونے کے متعلق خاص طور پر کوئی نص وارد نہ ہو اور جس میں کوئی حرام شدہ بات شامل نہ ہو وہ حلال ہے۔

مطبوعات

LANDMARKS OF JIHAD
جہاد کے امتیازی نشانات

تالیف: لفٹیننٹ کرنل ایم۔ ایم قریشی صاحب۔ شائع کردہ: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور۔ قیمت ۲۵ روپے۔ صفحات ۳۶۷۔

اسلام نے انسانیت کو جو دوسرے بہت سے حیات آفریں تصورات دیئے ہیں اُن میں جہاد کا تصوّر غیر معمولی نمایاں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس تصوّر کی وجہ سے جنگِ خیر اور بھلائی کی عملداری کے لیے مقدس جدوجہد کا ایک حصّہ قرار دی گئی۔ چنانچہ اس نئے مفہوم کے تحت اس کے ارفع و اعلیٰ مقاصد متعین ہوئے اور جنگ انسانی فلاح و بہبود، امنِ عامہ کے تحفظ، کمزوروں کی دادرسی اور انسان پر انسان کی خدائی اور جور و جفا کے استیصال کا ذریعہ قرار پائی۔ اس کے علاوہ جنگ لڑنے کے لیے ایسے نئے قوانین اور ضابطے معرضِ وجود میں آئے جن کی وجہ سے اس میں درندگی اور بہیمیت کا خاتمہ ہوا اور یہ ایک غیر انسانی فعل بننے کے بجائے ایک مہذب عمل قرار پائی۔

جنگ کا یہ نیا اخلاقی تصور صرف فلسفے تک محدود نہ رہا بلکہ مسلمانوں نے اس نئے تصور کے مطابق مختلف جنگیں لڑیں اور اپنے عمل سے اس بات کی شہادت فراہم کی کہ قوت کو نیک مقاصد کے حصول کے لیے کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر یُوں تو بے شمار اہلِ قلم نے ماضی میں لکھا ہے مگر حال میں بعض اُونچے منصب پر فائز فوجی افسروں نے جو فنِ حرب کا وسیع تجربہ بھی رکھتے ہیں اس موضوع پر نئی

(بقیہ: اِسلام میں حلال و حرام کا تصوّر)

نہ ہو۔ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے فقیہانہ کمال کا ایک نمونہ ہے۔ اسی سے یہ عظیم و مفید قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ کوئی عبادت شرعی طور پر جائز نہیں ہوسکتی جب تک اللہ تعالیٰ نے خود اُسے شریعت قرار نہ دیا ہو اور معمولاتِ زندگی میں سے کسی کو حرام نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ خود اللہ تعالیٰ نے اُسے حرام نہ کہہ دیا ہو۔

حربی تحقیقات کی روشنی میں قلم اٹھایا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس موضوع پر تازہ ترین کامیاب کاوش ہے۔ فاضل مصنف نے سب سے پہلے جہاد کے موضوع پر بڑے علمی انداز میں بحث کی ہے اور جہاد کی نمایاں خصوصیات کو نہایت اچھے انداز میں واضح کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ان خصوصیات کی روشنی میں چودہ جنگوں کا جائزہ لیا ہے جن میں جنگِ اُحد، جنگ یرموک اور جنگِ قادسیہ بھی شامل ہیں۔

فاضل مصنف نے مواد کی فراہمی، اس کی ترتیب و تدوین اور اس سے استنباط میں بڑی عرق ریزی اور دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔

یہ کتاب ہمارے علمی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس کاوش کے لیے کتاب کے فاضل مصنف اور ناشر دونوں ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔

تعلیماتِ اسلامیہ | تالیف مولانا محمد بن اسمٰعیل السلفی، استاذ علوم اسلامیہ سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور
ناشر: المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور ۲۔ قیمت ۵۰ء۴۔ صفحات ۲۸۸۔

زیرِ تبصرہ کتاب اگرچہ بی ایڈ کے نصاب کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے لیکن اس سے عام قارئین بھی اچھا خاصا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے مباحث اتنے جامع ہیں کہ ان میں اسلام کی پوری تعلیمات سمٹ کر آجاتی ہیں۔ آخر میں عربی زبان کے بنیادی قواعد کو بڑے اختصار کے ساتھ قلمبند کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے مصنف معروف عالمِ دین مولانا محمد اسماعیل صاحب السلفی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید ہیں اور سلامتیِ فکر کے ساتھ ٹھوس دینی معلومات بھی رکھتے ہیں۔

کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت اچھا ہے۔

(بقیہ اشارات)

اس لیے یہ اُن کی شہ پر زیادہ مُنہ زور دکھائی دے رہے ہیں۔ ممکن ہے وقتی طور پر اربابِ حکومت اور اُن کے حامی ان لوگوں کی ستم رانیوں اور زبردست آزاریوں سے محفوظ رہیں لیکن انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر غنڈہ گردی کی اِس بڑھتی ہوئی رَو کو بروقت نہ روکا گیا تو پھر یہ سیلاب کی صورت اختیار کرکے پُورے ملک کے امن کو غارت کر دیگی۔ وہ ملک جس میں لوگوں کو ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں، جس میں وہ ہر لمحہ اپنی آبرو کو غیر محفوظ پائیں، جس میں اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے بھی انہیں رشوتیں دینی پڑیں جس میں وہ ہر لحظہ سماج دشمن عناصر کے جبر و استبداد کی بھینٹ چڑھتے رہیں۔ اس کے عوام خاک ترقی کر سکتے ہیں۔ کوئی قوم خداداد صلاحیتوں کو یکسوئی کے ساتھ اسی صورت میں تعمیر و ترقی کی راہ پر لگا سکتی ہے جب اسے ذہنی طور پر سکون حاصل ہو اور اس کا ہر فرد اس بات کا اطمینان رکھتا ہو کہ اس کی جان، اس کا مال اور اس کی عزت و آبرو کو پُورا پُورا تحفظ حاصل ہے۔ عدمِ تحفظ کا احساس تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے بجائے تخریبی قوتوں کی آبیاری کرتا ہے اور انسان مثبت انداز میں سوچنے اور تعمیری انداز میں عمل کرنے کے بجائے منفی انداز میں سوچنے اور تخریبی انداز میں عمل کرنے لگتے ہیں۔ ہم صاحبِ صدر کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اس کی فکر کریں کہ لوگوں کے اندر عدمِ تحفظ کا جو احساس بڑی شدت سے پیدا ہو گیا ہے وہ دُور ہو اور اس کی جگہ اُن کے دلوں میں احساسِ تحفظ جڑ پکڑے۔ ہم انہیں اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں جو تعمیری قدم بھی اٹھائیں گے پوری قوم اس معاملے میں ان کی معاون و مددگار ہوگی۔

ایک اور سنگین مسئلہ جو قابلِ اطمینان حل کے لیے ان کے ناخنِ تدبُّر کا محتاج ہے وہ معاشی بدحالی اور تشویشناک حد تک بڑھتی ہوئی بیروزگاری کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ یُوں تو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی عوام کے لیے وجہِ پریشانی بنا رہا ہے اور کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا جس میں اس کے بارے میں لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو لیکن گذشتہ تین چار سالوں میں اس مسئلہ نے غیر معمولی طور پر سنگین صورت حال اختیار کر لی ہے۔ محنت کش کام کرنا چاہتے ہیں مگر انہیں کام نہیں ملتا اور ملتا بھی ہے تو اس سے اس قدر

کم یافتہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے جسم و روح کے رشتے کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ صدر صاحب ایقین جانیے یہاں کے عوام انسان نہیں بلکہ سانس لیتی لاشیں ہیں۔ وہ مایوسی کی تصویر ہیں۔ فاقہ مستی ان کی صلاحیتوں کو اس طرح چاٹ گئی ہے جس طرح دیمک لکڑی کو چاٹ جاتی ہے۔ یہ لوگ جس انداز سے غربت اور افلاس کا شکار ہو کر اپنی قوتوں کو ضائع کر رہے ہیں اس کے تصور سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔ صاحبِ صدر کو ان لوگوں کے حالات کو بہتر بنانے کی کوئی سبیل سوچنی چاہیے اور جذباتی اقدامات کے بجائے اس راہ میں کوئی ٹھوس اقدامات کرنے چاہییں۔ معاشی میدان میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کسی طرح پیداوار کی مشنیری جو جامد ہو چکی ہے اُسے پھر سے متحرک کیا جائے۔ اس کے لیے فوری طور پر چار ضرورتیں ہیں: خام مال کی فراہمی کا معقول بندوبست، تیار کردہ مال کی کھپت کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش، سرمایہ کا حصول اور پیدائشِ دولت میں کارکنوں کے لیے ایسے منصفانہ حصّے کا تعین جس سے نہ صرف وہ زندگی کی بنیادی ضروریات حاصل کر سکیں بلکہ اپنی استعدادِ کار بھی بڑھا سکیں اور اپنی صلاحیتوں کو ہنگاموں اور شورشوں کی نذر کرنے کے بجائے ملک کی تعمیر و ترقی میں کھپا سکیں۔

صاحبِ صدر اس سلسلے میں جو خدمت بھی پاکستان کے کسی فرد سے لینا چاہیں ہمیں یقین ہے وہ اسے بڑی خوشی سے انجام دینے پر آمادہ ہو گا۔

صدرِ مملکت اور ان کے وزراء اور مشیروں کی فوج ظفر موج ملک کی تعمیرِ نو کے لیے اس وقت جو منصوبے تیار کر رہی ہے وہ خواہ کتنے ہی خوش آئند ہوں مگر پاکستان کا ہر شہری اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہے کہ وہ پاکستان کی نظریاتی اساس یعنی اسلام جو اس کے وجود کا واحد جواز، اس کی قوت کا واحد سرچشمہ اور اُس کی ترقی کی واحد ضمانت ہے، کو کافی حد تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محترم بھٹو صاحب نے ایک دو مرتبہ اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اقدار اور اسلامی نظامِ حیات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس مسئلے میں کوئی عملی اقدام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی در آنحالیکہ انہیں اس کام کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے تھی کیونکہ غیر اسلامی طرزِ زندگی کی تباہ کاریوں کا پوری قوم حال ہی میں مشاہدہ کر چکی ہے۔ ہم صاحبِ صدر سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ اس معاملے میں ہاتھوں پر سرسوں جما دیں۔ مکمل اسلامی نظام کے قیام کے لیے بلاشبہ انہیں کچھ

مہلت ملنی چاہیے کیونکہ غیر اسلامی نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ مکمل اسلامی نظام کا قیام محنت طلب کام ہے لیکن ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس نیک کام کے آغاز کے لیے کیوں تاخیر کی جا رہی ہے جبکہ اس کے شروع کرنے کے لیے اس وقت حالات بھی بڑے سازگار ہیں۔ شراب و شاہد کے رسیا حکمرانوں کے ہاتھوں ملک کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اس سے عوام کے اندر برائیوں کے خلاف شدید نفرت کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اگر صاحبِ صدر اپنے وسیع اختیارات سے کام لے کر بعض صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لینے کا انقلابی قدم اٹھا سکتے ہیں، ملک کی بعض اونچی اور با اثر شخصیتوں، جن میں سابق جرنیل بھی شامل ہیں، کی آزادی سلب کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان برائیوں کے استیصال کا بندوبست نہ کر سکیں، جنہوں نے قوم کو زبردست تباہی سے ہمکنار کیا ہے اور جن کے مضر اثرات کو پاکستان کا ہر بہی خواہ نہ صرف پوری شدت سے محسوس کر رہا ہے بلکہ انہیں ختم کرنے کا دل و جان سے آرزو مند بھی نظر آتا ہے۔ صدر صاحب کے لیے کام کا یہ میدان ایسا ہے جس میں اختلاف کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ شاہد و شراب کو ختم کرنے کے لیے وہ جو سخت سے سخت قدم بھی اٹھائیں گے پوری قوم ان کی تائید کرے گی اور خدا کے حضور میں ان کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوگی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کر کے تو دیکھیں پھر انہیں قوم کے جذبات کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

(بقیہ فہرست ایجنٹ حضرات تفہیم القرآن)

۳۲ - ناظم مکتبہ العباس چوک سبزی منڈی، خان پور، ضلع رحیم یار خان

۳۳ - ملت بکڈپو، ریلوے روڈ، رحیم یار خان

۳۴ - اقبال بک ڈپو، اردو بازار، ہارون آباد

۳۵ - مکتبہ احیائے ملت، کپ بازار، ملتان

۳۶ - کاروان بک سنٹر صدر بازار، شاپنگ سنٹر ملتان

۳۷ - عبدالواحد، جامع اہلحدیث امین پور بازار لائل پور

۳۸ - سعید نیوز ایجنسی، رضا شاہ پہلوی روڈ راولپنڈی، فون نمبر ۶۸۲۲۶۱

۳۹ - مکتبہ افکارِ اسلامی، بازار تلواڑاں - راولپنڈی

۴۰ - عبدالعزیز دکان نمبر ۵-۲۱، ایریا مارکیٹ پی، او، ایف واہ کینٹ

۴۱ - ضیا بک ڈپو، بازار شہیداں، ہوتی مردان

۴۲ - مکتبہ اسلامی، بنک روڈ، مردان شہر

۴۳ - عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں بنوں شہر

۴۴ - فیض محمد ہری پور ہزارہ

۴۵ - شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ، ہزارہ

۴۶ - حکیم محمد اسحاق، ریلوے روڈ، حویلیاں ضلع ہزارہ

۴۷ - مکتبہ میسرز دارالادب بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز، لیاقت سٹریٹ پشاور کینٹ۔

۴۸ - عبدالقدوس صاحب قیم جماعت اسلامی صوبہ سرحد دفتر جماعت اسلامی - نیا دروازہ پشاور

۴۹ - مولانا محمد ایوب صاحب مقام و ڈاکخانہ تنگیکہ ضلع کیمبل پور

۵۰ - فیض احمد، سہیل بک ڈپو، سرگودھا

۵۱ - مکتبہ جوہر، فوارہ چوک جوہر آباد، ضلع سرگودھا

۵۲ - محمد اشرف، مسلم نیوز ایجنسی، چکوال، ضلع جہلم۔

۵۳ - بک ہاؤس چوک اردو بازار پوسٹ بکس ۲۴۳، لاہور

۵۴ - حافظ بشیر احمد نعیمی معرفت دفتر جماعت اسلامی، پتوکی ضلع لاہور

۵۵ - پاکستان بک ڈپو، صدر، راولپنڈی

اگر آپ کو تفہیم القرآن کی مطلوبہ جلدیں ہمارے ایجنٹ حضرات سے دستیاب نہ ہو سکیں تو آپ براہِ راست ادارہ کو اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیں۔

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

ٹیلیفون نمبر ۵۲۵۰۷ رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

ضروری اعلان

ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے خریدار اور ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت کے لیے جتنا کاغذ کا کوٹہ ماہوار درکار ہوتا ہے، پرمٹ پر اُتنا نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے باقی کاغذ بازار سے گراں نرخ پر خریدکر پرچے کی مطلوبہ تعداد پُوری کرنی پڑتی ہے۔

اِس لیے مجبوراً ہمیں پرچے کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا ماہ دسمبر سنہ ۷۲ء سے قیمت فی پرچہ ایک روپیہ اور سالانہ چندہ دس ۱۰/ روپے ہوگا

مینجر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور